پردۂ غفلت

از

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم، اے، پی ایچ، ڈی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

بار ہفتم ۱۰۰۰ قیمت عمر

اشخاص

میر الطاف حسین - رسول آباد کے زمیندار، عمر ۶۰ سال

رقیہ خاتون - ان کی بیوی، عمر ۵۲ سال -

صغرا - ان کی لڑکی، عمر ۲۲ سال -

محمد محسن - ان کے داماد، ناظر کلکٹری، عمر ۲۵ سال

منظور حسین - ان کا بھتیجا - میر شجاعت حسین مرحوم کا لڑکا، عمر ۲۷ سال -

سعیدہ - اس کی بہن، عمر ۲۰ سال -

شیخ کرامت علی - شجاعت حسین مرحوم کے اتالیق، عمر ۷۵ سال -

محمد جواد - مڈل اسکول رسول آباد کے ہیڈ مدرس، عمر ۳۶ سال -

محمد علی - ایک دوسرے قصبے کمال پور کا زمیندار، سعیدہ کا عاشق، عمر ۲۸ سال

احمد حسین - میر الطاف حسین کے سالے اور مختار عام، عمر ۴۵ سال -

گنگا سہائے - میر شجاعت حسین مرحوم کی جائداد کے منتظم، عمر ۶۵ سال

سیتا رام - مہاجن، عمر ۴۸ سال

چپراسی، خدمت گار، خادمہ

پہلا ایکٹ

پہلا سین

(میر الطاف حسین اپنے مکان کے سامنے نیم کے درختوں کے سائے میں ایک تکیہ دار مونڈھے پر بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں ہاتھ میں تسبیح ہے، وظیفے کا شغل جاری ہے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک مونڈھے پر احمد حسین اور بائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے سے ایک چارپائی کی پائینتی پر سیتارام مہاجن بیٹھے ہیں)

احمد حسین۔ (سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) چودھویں صدی ہے۔ خون سفید ہو گئے ہیں۔ جس چچا نے بچپن سے بیٹے کی طرح پالا، اس سے یہ سرکشی۔ اپنا گھر الگ کریں گے، اپنی جائداد سنبھالیں گے، بہن کو لکھا پڑھا کر میم بنائیں گے۔ آپ ہیں

خاندان کی آبرو مٹی میں مل جائے چاہے ......

سیتارام ۔ (بات کاٹ کر) آدمیاں یہ سب انگریزی پڑھائی کا قصور ہے۔ دیکھو نا صاحبزادے کے والد ہمارے تمہارے ساتھ اردو مڈل میں پڑھتے تھے، کیسے چپ چاپ میاں آدمی تھے۔ ہم تم مڈل فیل رہے اور وہ پاس ہو ہوا کر انگریزی اسکول میں پہنچے۔ تب سے کیسی دھواں دھار باتیں کرنے لگے اور لندن جاکر تو ایسے بدلے کہ کیا مجال کوئی کہہ سکے یہ وہی میاں شجاعت ہیں جو سر جھکائے بغل میں بستہ اور سلیٹ دبائے مدرسے جایا کرتے تھے۔

احمد حسین ۔ اور تو اور اس بڈھے کھوسٹ کرامت علی کو خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ شجاعت بھائی مرحوم کی لن ترانیاں سن کر اس کی عقل ماری گئی۔ منظور اور اس کی بہن دونوں کو خدا جانے کیا اُلٹا سبق پڑھایا کرتا ہے۔

میر الطاف حسین ۔ (خفگی کے لہجے میں) بھئی احمد حسین تم سے کتنی بار کہہ دیا کہ شیخ جی کا ذکر ایسے الفاظ میں نہ کیا کرو۔ کچھ بھی ہو والد مرحوم کے زمانے کے آدمی ہیں اور میرے تمہارے دونوں کے بزرگ ہیں۔

احمد حسین۔ بھائی صاحب ایسی بزرگی کو سات سلام۔ آخر خدا رسول کا حکم بھی کوئی چیز ہے۔ دین کی باتوں میں کسی کی بزرگی نہیں چلتی۔ ہم جب جانتے بڑے بزرگ ہیں جب لڑکے کو سمجھاتے کہ میاں نیچریت کے خیالات کو چھوڑ دو، بہن کو سیدانیوں کی طرح پردے میں بیٹھنے دو، چچا کی اطاعت کرو۔

سیتارام۔ اور ماموں کی؟

احمد حسین۔ ماموں کمبخت کس حساب میں ہے، وہ تو نالائق، جاہل، بے ایمان سمجھا جاتا ہے (میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر) کہئے قبلہ و کعبہ بڑوں کی اطاعت چھوٹوں پر فرض ہے کہ نہیں؟ پھر جو شخص بھتیجے کو چچا سے بغاوت کرنے پر ورغلائے اور لڑکیوں کو پڑھ لکھ کر غارت ہو جانے کی صلاح دے اس پر میں اعتراض کرتا ہوں تو کیا بُرا کرتا ہوں؟

میر صاحب۔ تمہیں کہاں سے معلوم ہے کہ شیخ جی اِن باتوں کی تعلیم دیتے ہیں؟ منظور ربچہ ہے اور اس کی طبیعت میں بے چینی ہے۔ جب مزاج میں یکسوئی آئے گی یہ باتیں جاتی رہیں گی۔

احمد حسین۔ بھائی صاحب خطا معاف، آپ ہیں فرشتہ خصال اور سب کو اپنا جیسا سمجھتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ کیا کیا ہانڈیاں پک

رہی ہیں۔ کل نیک رام ضلع سے واپس آیا ہے۔ اپنے مقدمے کے لئے وکیل کرنے گیا تھا۔ لالہ بالکشن کے یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ دوسرے مؤکلوں سے باتیں کر رہے ہیں، فرصت نہیں ہے۔ دو گھنٹے کامل انتظار کرنا پڑا، اس کے بعد دیکھتا کیا ہے کہ وکیل صاحب کے کمرے سے میاں منظور اور گنگا سہا سرگوشی کرتے ہوئے نکلے۔ دونوں نے اسے دیکھا مگر آنکھ بچا کر نکل گئے۔ اب فرمائیے اس کے کیا معنی ہیں؟

میر صاحب۔ واللہ اعلم۔ منظور کو کسی امر قانونی میں مشورہ کرنا ہو گا۔

احمد حسین۔ جی، وہ امر قانونی یہ ہے کہ اپنی اور بہن کی جائداد کو خاندان کی جائداد سے الگ کرانے کی درخواست دیں اور بہن کو لے کر کمال پور میں الگ گھر میں رہیں۔ پھر آزادی ہی آزادی ہے۔ بہن پہلے ہی سے پڑھی لکھی ہے، اسے مشن کی میم سے اور پڑھوائیں گے۔ پھر محمد علی کے ساتھ مل کر لڑکیوں کا مدرسہ قائم کریں گے۔ اور یہ سب سکھائی پڑھائی ہے جناب شیخ کرامت علی صاحب کی۔

میر صاحب۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ اور بفرضِ محال ایسا ہو بھی تو شیخ جی نے کبھی ایسی رائے نہ دی ہو گی۔

احمد حسین - اب آپ نہ مانیئے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ تھوڑے
دن میں آپ ہی معلوم ہو جائے گا۔

میر صاحب - اچھا میں منظور کو سمجھاؤں گا کہ مدرسے وغیرہ کا خیال
چھوڑ دے لیکن اگر وہ اپنی جائداد کا انتظام خود کرنا چاہتا ہے
تو اس میں کیا برائی ہے۔ اب بھی اس کی جائداد کی نگرانی منشی
گنگا سہائے کرتے ہیں اب وہ خود کرے تو کون سی قباحت ہے

احمد حسین - عرض کروں کون سی قباحت ہے؟ آدھے سے زیادہ
آمدنی جاتی رہے گی، اتنے بڑے خاندان کا سنبھالنا مشکل ہو جائے
گا۔ موجودہ آمدنی میں نہ معلوم کن مصیبتوں سے کام چلاتا
ہوں پھر تو لقمان کی حکمت سے بھی پورا نہ پڑے گا۔ دوسرے
یہ سیتا رام بیٹھے ہیں انہوں نے جن لوگوں سے یہ روپیہ قرض
لے کر ہمیں دیا ہے انہیں جب معلوم ہو گا کہ آدھی جائداد
صاف نکلی جاتی ہے تو وہ فوراً نالش داغ دیں گے۔

سیتا رام - سرکار، آدمیاں سچ کہتے ہیں۔ گنگا سہائے نے پہلے
سے لوگوں کو سنا رکھا ہے کہ چھوٹے میر صاحب کی جائداد
سے قرضے سے کوئی مطلب نہیں۔ اب بٹوارہ ہو گا تو بالکل
ساکھ جاتی رہے گی۔

میر صاحب۔ مگر یہ تو سچ ہے نہ شجاعت مرحوم نے کبھی قرضہ
لیا نہ منظور نے، اور اس کی بہن تو شاید ابھی قانوناً بالغ
بھی نہیں ہے۔

احمد حسین۔ جی بالکل درست ہے، کسی نے قرضہ نہیں لیا۔ یہ تو
مجھ کمبخت کی شامت آئی تھی کہ صغرا کی شادی میں خاندان
کی آبرو رکھنے کے لیئے، محرم اسی شان سے کرنے کے لیئے
جیسا بزرگوں کے وقت سے ہوتا چلا آ رہا ہے، سال بھر
کا جمع خرچ پورا کرنے کے لیئے میں نے قرض لیا۔ لیکن کیا
میاں منظور اور ان کی بہن دونوں خاندان سے الگ تھے
کیا میرے آپ کے بزرگ ان کے بزرگ نہ تھے، جوان
کی جائداد قرضے سے بری ہے۔

سیتارام۔ سرکار یہ تو پکّی بات ہے۔ ہم لوگوں کے گھر میں بھی
سب کاروبار ایک میں ہوتا ہے، سب کی آمدنی ایک
ہوتی ہے، خرچ ساتھ ہوتا ہے، قرضہ بھی سبھی کے لیئے لیا
جاتا ہے۔

میر صاحب۔ بھئی میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں۔ منظور
دو چار دن میں آئے گا تو اس سے گفتگو کروں گا۔

احمد حسین ۔ خدا ہی ہے جو آپ کے سمجھانے کا اثر ہو، صاحبزادے
اپنے آپ کو افلاطون سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں کسی کی بات
کب جچتی ہے ۔ پھر انہیں مشیر ملے ہیں شیخ کرامت علی،
اور دوست محمد علی ۔ اس لڑکے کے ارادے شجاعت
بھائی مرحوم کی حیات ہی سے یہ ہیں کہ سعیدہ سے شادی
کرے ۔ جانتا تھا کہ بھائی مرحوم ہمارے خاندان کی رسم
کے خلاف آدھی جائداد لڑکی کے نام چھوڑیں گے ۔ لیکن مرحوم
نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا۔

میر صاحب ۔ یہ تو تم صریحاً غلط کہتے ہو ۔ شجاعت مرحوم اس
لڑکے کو بہت چاہتے تھے ۔ وہ ہوتے تو ضرور اسی سے
شادی کرتے ۔

احمد حسین ۔ اب میں آپ کی تردید کیسے کر سکتا ہوں ۔ آپ ہمشیرہ
صاحبہ سے پوچھئے ۔ ایسا ہوتا تو وہ سعیدہ کی نسبت محمد جوّاد
سے کیوں ٹھہراتیں ۔

میر صاحب ۔ یہ وہ جانیں یا تم ۔ میرے نزدیک تو یہ نسبت ہی
زبردستی کی ہے ۔ نہ لڑکی راضی ہے نہ اس کا بھائی ۔

احمد حسین ۔ شادی کے معاملے میں لڑکے لڑکی کی رضامندی کا خیال

کرنا انوکھی بات ہے۔ شریف گھرانوں میں لڑکی سے جا کر
کوئی نہیں پوچھا کرتا۔ ماں باپ جیسا اولاد کی بہتری کو
سمجھتے ہیں وہ خود کیا سمجھے گی۔ اب رہے لڑکی کے بھائی صاحب
تو چچا چچی کے ہوتے انہیں بولنے کا کون منصب ہے۔

میر صاحب۔ مگر بھائی منظور بہت برہم ہے۔ اگر لڑکی کی شادی
جوّاد سے کر دی گئی تو خاندان میں نا اتفاقی کی بنیاد پڑ
جائے گی۔

احمد حسین۔ بہر حال نسبت تو ٹھہر چکی ہے اور شادی جوّاد
سے ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو دنیا بھر کے سامنے
ناک کٹ جائے گی کہ بندھی بندھائی نسبت چھوٹ گئی۔

میر صاحب۔ خیر ہوگا (آس پاس نظر ڈال کر) نماز کا وقت آگیا
ہے۔ (اٹھتے ہوئے سیتا رام کی طرف مخاطب ہو کر) لالہ صاحب
آپ کو جو کچھ گفتگو کرنا ہے احمد حسین سے کیجئے۔ آپ جانتے
ہیں کہ مجھ سے تو کسی بات سے مطلب نہیں۔

سیتا رام۔ سرکار آپ اور آمد میاں کچھ دو تھوڑی ہیں۔
ہم آپ کے بھی تابعدار ان کے بھی۔ اور آپ لوگوں
سے بھلا ہم کاروبار کی بات چیت کریں گے، گھر کا کام

جان کر کرتے ہیں۔

میر صاحب۔ بے شک آپ سے ایسی ہی امید ہے۔

(چلے گئے)

سیتارام۔ میاں یہ تو بڑی بے ڈھب خبر سنائی۔ منظور میاں نے اگر سچ مچ درخواست دے دی تو اتنی بڑی جائداد ہاتھ سے گئی۔

احمد حسین۔ درخواست دینے میں کیا کچھ کسر ہے۔ بالکشن کو تم جانتے ہو ایک ہی کائیاں ہے۔ اس سے یہ کب امید ہو سکتی ہے کہ روک تھام کرے۔

سیتارام۔ پھر کیا کرنا چاہیے؟

احمد حسین۔ تم بتلاؤ لالہ، تم مقدمے کے معاملے میں جتنا جانتے ہو ہم تھوڑی جان سکتے ہیں۔

سیتارام۔ نہیں آمد میاں، ہم نے جو ایک آدھ حرف قانون سیکھا ہے سب آپ کے طفیل ہیں، لیکن اس معاملے میں ہماری سمجھ میں خود کوئی بات نہیں آتی۔

احمد حسین۔ پھر بھلا جب تمہاری فطرت نہیں چلتی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

سیتارام۔ ایک بات کہوں اگر آپ خفا نہ ہوں۔

احمد حسین۔ کہو کہو، خفا ہونے کی کیا بات ہے۔

سیتارام۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر جھکے سے) کہیں ایسا ہوتا کہ شجاعت میاں کی لکھی ہوئی دستاویز نکل آتی کہ انہوں نے پچاس ہزار روپے بیس سال پہلے بڑی سرکار سے قرض لئے تھے۔

احمد حسین۔ دستاویز کہاں سے نکل آتی۔ میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔

سیتارام۔ جہاں سے لچھمن کی دستاویز بے دخلی کے مقدمے میں نکل آئی تھی۔

احمد حسین۔ اچھا یہ مطلب ہے۔ مگر سنو تو سہی یہ فقرہ کیسے چل سکتا ہے۔ بھائی صاحب ابھی ابھی کہہ چکے ہیں کہ شجاعت بھائی نے کبھی قرض نہیں لیا، وہ جو پوچھیں گے یہ دستاویز کیسی ہے۔

سیتارام۔ کہہ دیجئے گا کہ روپیہ تھوڑا تھوڑا کر کے لیا تھا اور دستاویز کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا آپ بھول گئے۔

احمد حسین۔ واہ، یہ ایسی سہل بات ہے؟ وہ دیکھنے کو مانگیں گے

اور خط کا فرق کوئی نہ پہچانے وہ پہچان لیں گے۔
سیتارام۔ تو ان کو سمجھانے کی آپ کوئی فکر کیجئے۔ اب اتنا بھی آپ نہیں کر سکتے؟
احمد حسین۔ نہیں لالہ، یہ میرے کیا کسی کے بس کی بات نہیں تم بھائی صاحب کو جانتے ہو پھر ایسی باتیں کرتے ہو۔ اگر کوئی پیچیدہ معاملہ ہو تو خیر، ورنہ جہاں ان کی سمجھ میں آگیا تو وہ ہرگز ان قانونی چالوں کے روادار نہیں ہوتے۔
سیتارام۔ پھر اور تو کوئی بات سوجھ نہیں پڑتی۔ آپ منظور میاں کو سمجھائیے کہ زمینداری کا کام بڑے بکھیڑے کا ہے، اس میں نہ پڑو۔ رہا خرچ، اس کی تمہیں کبھی کمی نہ ہوگی، سب کچھ تمہارا ہے۔ اسی کو ذرا نمک مرچ لگا کر کہیے تو شاید مان جائیں۔
احمد حسین۔ جی ہاں، میرے ہی سمجھانے سے تو وہ مانیں گے! میری تو انہیں صورت سے نفرت ہے دوسرے یہ کہ ان سے منطق کی بحث کون کرے گا۔
سیتارام۔ پھر بالکل سے سمجھوتہ کیجئے، کسی طرح لڑکے کو پٹی

پڑھا دے کہ چچا کی زندگی میں عدالت سے بٹوارے کی
اجازت نہیں ہو گی۔

احمد حسین ۔ لالہ تم بھی بعض وقت عجیب باتیں کرنے لگتے ہو۔
ایسے بھی منظور بچے نہیں کہ جو کچھ بالکشن کہہ دے وہ مان
لیں گے ، اور پھر کرامت علی جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے
ہوئے ہے اور محمد علی جیسے قانون از بر ہے ان کے صلاح
کار جو بیٹھے ہیں۔

سیتارام ۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) ایسا ہی ہے تو منظور میاں
کے حصے سے ہاتھ دھونا چاہیئے اور چھوٹی بٹیا کے حصے کو کسی
طرح بچانا چاہیئے۔

احمد حسین ۔ یہ بھی کچھ ایسا سہل نہیں ہے ۔ یہ سچ ہے کہ محمد جوّاد
سے شادی ہو جائے تو وہ تو اپنا آدمی ہے اور جائداد اپنے
ہی انتظام میں رہے گی ، لیکن شادی ہو جائے تو جانیئے۔

سیتارام ۔ اگر سیدانی بی اپنی بات کی پیچ کریں تو ضرور ہو گی۔

احمد حسین ۔ ارے لالہ تم اس نئی پود کو نہیں جانتے ہو ۔ یہ لوگ
اپنی عقل کے آگے سات پشت تک کے بزرگوں کی کوئی
ہستی نہیں سمجھتے ۔ ان کے دماغ میں یہ سما گئی ہے کہ دنیا کی

اصلاح کریں گے، اور وہ کیسے، عورتوں کو لکھا پڑھا کے
اور ان کا پردہ توڑ کے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ یہ
اب تک دنیا کیسے چل رہی تھی اور اب کیا مصیبت آن
پڑی ہے کہ عورتیں پڑھ لکھ کر قانون گو ہو جائیں اور گاؤں
گاؤں ماری ماری پھریں؟

سیتارام ۔ واہ آمد میاں آپ بھی کیا خوب وکیل مختاروں کی
سی بحث کرتے ہیں ۔ مگر ہم سے پوچھئے تو یہ سب انگریزی
کتابوں کا پھیر ہے ۔ ہمارا چھوکرا ابھی چھٹی میں گھر آیا تھا اس کی
کتاب اٹھا کر دیکھی ۔ تصویریں تو اچھی چکنی چکنی ہیں مگر قسم لیجئے جو
ایک حرف بھی سمجھ میں آیا ہو، جس زبان کی الف بے ایسی ہو
اس کی کتابوں میں نہ جانے کیا کچھ لکھا ہو گا۔

احمد حسین ۔ اجی کچھ بھی لکھا ہو میری طرف سے جہنم میں جائے۔ یہاں
اپنی ہی مصیبت کیا کم ہے جو ان جھگڑوں کی فکر ہو۔ اچھا لالہ،
میں جاتا ہوں ذرا گاؤں کا ایک چکر لگاؤں گا۔

(اٹھ کھڑے ہوئے)

سیتارام ۔ بہت اچھا، مگر کل سودہ پہنچنے کا دن ہے اسے نہ بھولئے گا

(پردہ گرجاتا ہے)

دوسرا سین

(شیخ کرامت علی ڈیوڑھی میں ایک مونڈھے پر رضائی اوڑھے بیٹھے ہیں۔ اندر کی طرف کے دروازے میں پردہ پڑا ہے جس کے پیچھے رقیہ خاتون ابھی ابھی آکر بیٹھی ہیں)

(پردے کے پیچھے سے رقیہ خاتون کی آواز) شیخ جی، بندگی عرض ہے۔

شیخ جی۔ جیتی رہو سیدانی بی، خدا گھر بار میں برکت دے۔

رقیہ خاتون۔ کہیے شیخ جی، اب مزاج کیسا ہے۔ اس کھانسی نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔

شیخ جی۔ کیسے؟ مجھے؟ نہیں سیدانی بی بڑھاپے میں تو کھانسی تکیہ کلام ہو گئی ہے۔ سننے والوں کو اس سے تکلیف ہو مجھے تو آرام ملتا ہے۔

رقیہ خاتون ۔ سچ ہے شیخ جی بڑھاپا سو بیماریوں کی بیماری ہے
آپ تو خدا رکھے پانچ اوپر ستر برس کے ہیں ۔صغرا کے
باپ کو ابھی ساٹھ پورے نہیں ہوئے وہ بھی سدا کے روگی
ہو گئے ہیں۔

شیخ جی ۔ اجی الطاف میاں کی نہ کہئیے ، وہ جوانی ہی میں کون
تندرست تھے ۔ بات یہ ہے کہ جب انسان ایک اندھیری
کوٹھری میں رات دن جانماز پر بیٹھا رہے گا تو صحت آپ
ہی خراب ہوگی۔

رقیہ خاتون ۔ بس شیخ جی آپ کی انہیں باتوں سے تو آگ لگ
جاتی ہے ۔ آپ کے نزدیک جو اللہ کا نیک بندہ نماز وظیفے
میں اپنے دن رات کاٹے وہ احدی اور نکما ہے

شیخ جی ۔ اے لو سیدانی بی خفا ہو گئیں ۔ میں نے تو ایک بات کہی
تھی ان پر اعتراض کب کیا تھا۔

رقیہ خاتون ۔ آپ منہ سے نہ کہیں مگر دل میں یہی ہے ۔ کہئے میں
جھوٹ کہتی ہوں۔

شیخ جی ۔ اب آپ کہلواتی ہیں تو کہتا ہوں ۔ میر الطاف حسین کے
کاہل ہونے میں کیا شبہہ ہے ۔ جو شخص دنیا میں اپنے خاندان

کو نہ سنبھال سکے، جو اپنے ہمسایوں کا حق نہ ادا کر سکے، جو اپنی جائداد کو اپنے نالائق سالے اور ایک بے ایمان مہاجن کے ہاتھوں برباد ہونے کے لئے چھوڑ دے، وہ کاہل نہیں تو کیا ہے۔

رقیہ خاتون۔ دیکھو نہیں جانتی تھی کہ صغرا کے باپ اور احمد حسین کو صلواتیں سنانا آپ کو منظور تھا۔ میں احمد حسین کی طرف سے تو کچھ نہیں کہتی، لوگ کہیں گے بہن ہے طرفداری کرتی ہے۔ لیکن صغرا کے باپ کو کوئی دوسرا کچھ کہتا تو منہ جھلس دیتی۔ غضب خدا کا اس شخص نے دنیا کو چھوڑا، چین آرام تج دیا، دن رات کی عبادت میں اپنی جان ہلکان کر دی اور لوگوں کے نزدیک کاہل ہے۔

شیخ جی۔ سیدانی بی کاہلی اسی کا نام نہیں ہے کہ آدمی سچ مچ ہاتھ پیر نہ ہلائے، جو شخص اپنی سمجھ سے کام لینا نہیں چاہتا اور زندگی کی گتھیوں کے سلجھانے سے جی چُراتا ہے وہ سب سے بڑھ کر کاہل ہے۔ محض اللہ اللہ کرنے سے کوئی شخص اللہ کا نیک بندہ نہیں بن جاتا، اس کے لئے پہلی شرط ہے کہ انسان دنیا میں اپنا فرض جانے اور ادا کرے، اللہ کے

اور بندوں کے لئے مصیبت نہیں بلکہ راحت کا باعث ہو

رقیہ خاتون۔ اے ہے تو اس بیچارے نے کس کے سر مصیبت ڈھائی ہے۔

شیخ جی۔ اس بیچارے نے مصیبت ڈھائی ہے اپنی اسامیوں پر۔ جن کا خدا نے اس سے سابقہ ڈالا تھا اور جنھیں اس نے میاں احمد حسین کے سپرد کر دیا کہ پولیس سے مل کر انھیں لٹوائیں۔ اس نے مصیبت ڈھائی ہے اپنے خاندان پر جس کی آدھی جائداد اس کی نمازگزاری کی بدولت مہاجن کے قبضے میں جا رہی ہے۔ اس نے مصیبت ڈھائی ہے اپنے بیٹے اور بھتیجے پر جن کی تعلیم و تربیت کو اس نے آپ پر چھوڑ رکھا ہے

(کھانسنے لگے)

رقیہ خاتون۔ یا اللہ! یا اللہ! اب میری باری آئی۔ شیخ جی آپ بزرگ ہیں اس لئے زبان روک کر رہ جاتی ہوں، مگر اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بڑھاپے میں آپ کا دماغ صحیح نہیں رہا ـــــ میں آئی تھی ایک معاملے میں صلاح کرنے مگر سٹری سودائیوں سے کون باتیں کرے۔ لیجئے بندگی میں جاتی ہوں۔

شیخ جی۔ (ہنس کر) آپ نے خود ہی چھیڑ چھیڑ کر کہلوایا ورنہ میں نے تو آپ لوگوں کو عقل کی سمجھانے سے توبہ کرلی ہے۔ اچھا، لیجیے اب غصّے کو تھوک دیجیے۔ میر الطاف حسین میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں۔ آپ کہیں تو سنا چلوں، سیدانی بی — ہائیں کیا سچ مچ چلی گئیں؟

رقیہ خاتون۔ کیا کروں بیٹھ کے، اِنسان اپنے حواس میں ہو تو اُس سے بات کی جائے۔

شیخ جی۔ اچھا اب سے ہے، میں سمٹ سمٹا کے حواس میں سمایا جاتا ہوں

رقیہ خاتون۔ لیجیے اب گالیاں دینے سے تھکے تو دل لگی کرنے لگے۔ کہتی ہوں کہ بڑی ضروری باتیں کرنا ہیں۔

شیخ جی۔ یا اللہ تو ضروری باتیں کیا ضرور ہے کہ رو رو کے کی جائیں اور کراہ کراہ کے سنی جائیں۔ آپ کہہ چلیے، میں بہت غور سے سُن رہا ہوں۔

رقیہ خاتون۔ کچھ نہیں، بات یہ ہے کہ مجھے سعیدہ کی طرف سے بڑی فکر ہے۔ یہ لڑکی ایسی گھنّی ہے کہ اس کے دل کی بات ہی سمجھ میں نہیں آتی۔ دن بدن دُبلی ہوتی جاتی ہے اور اوپر سے پڑھنے کی ہوس ہے۔ ویسے تو میں روک تھام

کرتی ہوں لیکن جب بھائی یہاں ہو تو سوائے کتاب سے
سر مارنے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اور یہ منظور تو
دنیا سے انوکھا لڑکا ہے۔ اس نے میری بچّی کو خدا جانے
کیا سمجھا دیا ہے کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئی ہے۔ میں دن
رات چیخا پیٹا کرتی ہوں مگر نہ تو وہ خدا کی بندی منہ سے کچھ
کہتی ہے اور نہ میرے کہنے پر کان دھرتی ہے۔

شیخ جی۔ جہاں تک میں سمجھا آپ کو اس سے دو شکائتیں ہیں ایک
یہ کہ پڑھنے کا شوق رکھتی ہے دوسرے یہ کہ اُداس رہا
کرتی ہے اور اس کا علاج آپ یہ کرتی ہیں کہ اُسے پڑھنے
نہ دیں اور اُس پر خفا ہوں۔

رقیہ خاتون۔ آپ نے پھر اُلٹی اُلٹی باتیں کرنا شروع کیں۔
میں اُس پر خفا ہوتی ہوں تو اس کی بھلائی کے لئے یا خدانخواستہ
دشمنی سے؟

شیخ جی۔ سیدانی بی سنئے سعیدہ کو میں نے گود میں کھلایا ہے اور
اس کے باپ کو بچپن سے پڑھایا ہے۔ اس لڑکی کی طبیعت
کی افتاد آدمی جب سمجھ سکتا ہے جب اُس کے باپ کی سیرت
سے خوب واقف ہو۔ شجاعت حسین آپ کے دیور تھے

مگر اُن کو نہ آپ نے پہچانا نہ آپ کے شوہر اور بھائی نے
اور سچ پوچھئے تو سوائے میرے اور چند اور لوگوں کے
کسی نے بھی نہیں۔ اگر میں آپ کو اُن کی طبیعت اور اُن
کے خیالات سمجھاؤں تو آپ کیا سمجھیں گی۔ اتنا سن لیجئے کہ مرحوم
ایسا دماغ رکھتے تھے جو روزمرّہ زندگی سے آگے کچھ سوچ
سکتا تھا اور ایسا دل جو اپنے اور اپنے خاندان کے رنج و
راحت کے علاوہ اور باتوں کا بھی احساس رکھتا تھا۔ ایسے
لوگوں پر ان ذرا ذرا سی باتوں کا بہت اثر ہوتا ہے جو آپ
کے نزدیک کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ سعیدہ اُن کی بیٹی ہے اور
اس نے منظور سے کہیں زیادہ اُن کی طبیعت پائی ہے۔
علاوہ اس کے وہ عورت ہونے کے سبب سے اُن
سے بڑھ کر زود طبیعت میں رکھتی ہے۔ اس کے سے
لوگ دنیا میں محض کھانے پینے اور سونے کے لئے نہیں
بلکہ قلب و دماغ سے بھی کام لینے کے لئے پیدا ہوتے
ہیں اور اگر انھیں اپنے خیالات و احساسات کو الفاظ میں
اور مقاصد کو کاموں میں ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے۔
تو یہ دل ہی دل میں کڑھتے ہیں اور اُن کی زندگی خاموشی

افسردگی اور حزن و ملال بن کر رہ جاتی ہے۔ اب اس لڑکی کا دل تو ٹھہرا اس درجہ اثر پذیر اور پیدا ہوئی ہے وہ ایسے ملک میں جہاں عورت کو جاننے، سوچنے اور کرنے کی ممانعت ہے تو جو نتیجہ ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے اس پر طُرّہ ہے آپ کی محبت جو اس کے تھوڑے بہت پڑھنے کو بھی روکنا چاہتی ہے اور تنبیہہ و سرزنش سے اس کے دل کو اور صدمہ پہنچاتی ہے۔

رقیّہ خاتون۔ شیخ جی میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں کہ لڑکی سچ مچ شیشے کا سا دل رکھتی ہے مگر یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ میں نصیحت کرنا چھوڑ دوں۔ جوان لڑکی کی تعلیم آسان نہیں ہے۔ اگر گھرکی جھڑکی سے کام نہ لوں تو کل کو میری برابری کرنے لگے گی۔ خیر، میں نے جس بات میں صلاح لینے کے لئے آپ کو بلایا تھا وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اگر سعیدہ کی شادی ہو جائے تو گھر کے کام دھندے میں اس کا جی بہل جائے گا۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

شیخ جی۔ یہ لیجئے پھر آپ نے دیوانے کو ہُو کی کنجی دے دی۔ میں

ابھی اپنی پہلی تقریر سے ہانپ رہا ہوں۔ آپ نے وہ
بات کہدی کہ اُبل پڑنے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کے سامنے
بکواس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے اب میں آپ
کی بات کا نہایت اختصار سے جواب دیا کروں گا۔ آپ جو
مجھ سے پوچھتی ہیں یہ میرے نزدیک سعیدہ سے پوچھنا چاہئے۔

رقیہ خاتون۔ اور سنو لوگو، میں لڑکی سے جا کر اس کی شادی کی
باتیں کروں۔ شیخ جی آپ کی حیا شرم کو آخر کیوں آگ
لگ گئی۔ یہ باتیں لڑکیوں سے دنیا میں کوئی کرتا ہے۔ باپ
ماں، چچا چچی آخر کا ہے کے لئے ہوتے ہیں؟

شیخ جی۔ جواب سے بخوف طوالت قطع نظر کر کے گذارش ہے کہ
آپ سعیدہ کی شادی کس سے کرنا چاہتی ہیں؟

رقیہ خاتون۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اسی سے جس سے
منگنی ہوئی ہے۔

شیخ جی۔ یعنی مسمی محمد جواد مدرس مڈل اسکول سے۔

رقیہ خاتون۔ اور نہیں تو کس سے؟

شیخ جی۔ میں اس کے بالکل خلاف ہوں۔

رقیہ خاتون۔ کیوں آخر؟

شیخ جی۔ نمبر ایک، جو ادجہلِ مرکّب ہے۔ نمبر دو سعیدہ کی اور اس کی طبیعت میں راجہ بھوج اور گنگا تیلی کا فرق ہے۔ نمبر تین، وہ ایک دوسرے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

رقیہ خاتون۔ صاف صاف کیوں نہ کہیئے کہ آپ سعیدہ کی شادی محمد علی سے ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو جو منصوبے گھٹتے ہیں وہ مجھ سے چھپے ہوئے ہیں مگر میں ایسی ننھی نہیں ہوں مجھے رتی رتی کی خبر ہے اور سب کو سنا کر کہتی ہوں کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میری بچّی کا بیاہ اس بدنصیب محمد علی سے نہیں ہو سکتا۔

شیخ جی۔ آپ کا یہ خیال ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دونوں طرف کی دنیا اپنی اپنی جگہ پر قائم رہے گی اور آپ کی بچّی کا بیاہ محمد علی سے رچے گا۔

رقیہ خاتون۔ وہ کون تیس مار خاں ہے جو میرے مقابلے میں آئے گا؟ میں بھی تو سنوں اُس کا نام۔

شیخ جی۔ لیجئے سنئے۔ اس کا نام ہے ——— سعیدہ۔

رقیہ خاتون۔ بس۔ میں تو سمجھی تھی کہ کوئی بڑا رستم ہے۔ میاں منظور صاحب بہادر کو آپ کیوں بھول گئے؟

شیخ جی۔ سعیدہ کا مقابلہ ایک تو آپ کی اور احمد حسین کی قوتِ جسمانی سے ہے اور دوسرے خاندان اور قوم کی رائے سے۔ پہلے معاملے میں بیشک منظور اس کی مدد کرے گا مگر دوسرے میں وہ آپ اپنی مددگار ہوگی کیونکہ اس کا دل قوی ہے اور ارادہ مضبوط۔

رقیہ خاتون۔ (طعن آمیز ہنسی کے ساتھ) کیوں نہیں یہ دبو گم صُم لڑکی ضرور کنبے قبیلے سے لڑائی لڑے گی۔ اچھا ہے میں بھی تماشا دیکھوں گی۔

شیخ جی۔ جی ہاں یہی بے زبان لڑکی سارے جہان کا مقابلہ کریگی میں کہہ چکا ہوں کہ آپ اس لڑکی کو نہیں پہچانتی ہیں۔ سنئے دنیا کے دو تمدنوں کے ٹکرانے سے ایک شرارہ پیدا ہوا ہے جس کا مخزن اس لڑکی کا دل ہے۔ ایشیا کے مغرب سے ایک قوم عزم، حوصلہ اور جرأت لے کر آئی اور مشرق میں ایک دوسری قوم تھی جو صبر، ایثار اور درد رکھتی تھی۔ دونوں کے صدیوں تک ساتھ رہنے سے ایک نئی سیرت کا خمیر تیار ہوا جس کے اجزا میں دونوں قوموں کے جوہر ملے جلے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ ان دونوں

قوموں کے مردوں نے اس دولت کے لینے سے
انکار کیا اور کہا یہ ہماری چیز نہیں ہے، مگر عورتوں نے
چپکے سے اپنے قلب میں چھپا لیا۔ اب چونکہ عورتوں کے
دل پر جہالت اور غفلت کے بندوں نے پہرا بٹھا رکھا
ہے اس لئے اور بہت سے بیش بہا خزینوں کی طرح یہ
امانت بھی زمانے کی نظروں میں پنہاں ہے۔ اس سعیدہ
نے خوش قسمتی سے ایسا باپ پایا جس کی بدولت وہ کم
سے کم خود اس سے واقف ہو گئی ہے کہ اس کے پاس
کیا بے بہا دولت ہے۔ اب آپ کی اور سارے زمانے
کی مخالفت کو وہ صبر، خاموشی اور مسکینی سے برداشت
کرتی ہے لیکن اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ بہن بھائیوں کی
سختی نے اس کے عزم کو دبا دیا ہے اور اس کے حوصلے
کو توڑ دیا ہے تو آپ سے بڑھ کر کوئی غلطی پر نہیں۔ وہ
دن آرہا ہے کہ آپ پر بھی اصل حقیقت عیاں ہو جائیگی
رقیہ خاتون۔ شکر ہے آپ نے بس تو کی۔ میں تو سمجھی تھی ختم
ہوئی۔ اب مجھے آپ کے سٹھیا جانے میں مطلق شبہہ نہیں
رہا۔ خدا جانے کہاں کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ لڑکی

کے دل میں پورب پچھم، خمیر، خزانہ، خاک دھول،
خدا جانے کیا کیا ہے۔ خیر میں آپ کا عندیہ لینے آئی تھی
معلوم ہو گیا کہ آپ نے بھی میری دشمنی پر کمر باندھی ہے
بہت خوب، زندگی ہے تو دونوں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا
ہے۔ اچھا بندگی عرض ہے میں جاتی ہوں۔

شیخ جی۔ جیتی رہو۔ (اُٹھ کر باہر کی طرف چلے)
(آپ ہی آپ) یہ تو سچ کہتی ہے لڑکی، میں ضرور سٹھیا گیا ہوں
ورنہ اس کے سامنے ایسی باتیں کیوں کرتا جو اس کے کھوپڑی
برابر دماغ میں کسی طرح نہیں سما سکتیں۔ دوسرے اُسے
اِس طرح مشتعل کر دینا بھی بُرا ہے مگر میں مجبور ہوں، بڑھاپے
کے سبب سے زبان پر قابو ....
(ڈیوڑھی کے دروازے سے نکل گئے)

(پردہ گرجاتا ہے)

تیسرا سین

(ایک چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہے اور اس کے پاس ایک چھوٹا سا تخت ہے جس پر منہ دھونے کا سامان اور نیچے ایک تسلہ رکھا ہے۔ کمرے میں ایک طرف ایک چھوٹی سی میز اور اس کے سامنے اور سیدھی طرف ایک ایک کرسی رکھی ہے۔ میز پر چند کتابیں اور قلم دوات وغیرہ ہے۔ کونے میں ایک الماری پر چند کتابیں رکھی ہیں، دیوار پر ایک نقشہ لٹکا ہوا ہے۔)

سعیدہ تخت پر بیٹھی منہ دھو رہی ہے۔ چند منٹ کے بعد رقیہ بیگم کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ سعیدہ جو اب منہ دھو چکی ہے اور تولیہ سے خشک کر رہی

ہے اسے چھوڑ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

سعیدہ۔ تسلیم عرض ہے، چچی جان۔

رقیہ خاتون۔ جیتی رہو بیٹی، خدا عمر دراز کرے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟ رات کو دشمنوں کو بخار تھا۔

سعیدہ۔ جی ہاں، خفیف سی حرارت تھی۔ اب اچھی ہوں۔

رقیہ خاتون۔ میں رات کو ادھر سے گزری تو دیکھا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا، میں نے فوراً بند کیا۔ تمھیں اتنا سمجھایا کہ بخار میں ہوا نقصان کرتی ہے، مگر تم پر اثر نہیں ہوتا۔

سعیدہ۔ چچی جان رات گرمی بہت تھی۔

رقیہ خاتون۔ بٹیا مانا کہ گرمی تھی، مگر صحت کا خیال مقدم ہے۔ پسینہ آتے میں ہوا کا لگ جانا بہت بُرا ہے۔ آخر ہم لوگوں کی اتنی عمر آئی ہے، ہم نے بھی کچھ دنیا میں دیکھا ہے! تم نے دو حرف کیا پڑھ لئے ہیں کہ اپنے نزدیک گھر بھر سے زیادہ عقل مند ہو گئی ہو۔ اور سچ پوچھو تو اس پڑھنے ہی نے تمھیں بیمار ڈالا ہے۔ دن بھر میرے ساتھ باورچی خانے میں کام کرنا، سینا پرونا اور رات کو بیٹھ کر پڑھنا۔ صغرا کہتی تھی کہ گھڑی بھر پڑھنے سے سر

میں درد ہونے لگتا ہے، نہ کہ دو دو گھنٹے سر مغزن کرنا بات ساری یہ ہے کہ آج کل بھائی موجود ہیں، اس لیے دماغ عرش پر ہے۔

سعیدہ۔ (کچھ جواب نہیں دیتی بلکہ اثنائے گفتگو میں ایک جھاڑن لے کر اپنی میز صاف کرنے لگتی ہے۔)

رقیہ خاتون۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا یہ پڑھنا ہے کاہے کے لیے قرآن پڑھ لیا، نماز روزے کے مسائل تحفۃ العوام میں سے نکال لیتی ہو، اب خون پانی ایک کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ ہاں خوب یاد آیا صغرا کہتی تھی کہ تم نے اسے خط لکھ کر بھیجا تھا۔ آخر تم چاہتی کیا ہو؟ کیا بالکل ہی خاندان کی ناک کٹوانے کا ارادہ ہے؟ جو سنے گا وہ کیا کہے گا کہ میر سجاد حسین کی پوتی تحریریں لکھتی ہے! شجاعت مرحوم کو خدا بخشے جانے کیا سوجھا کہ لکھنا سکھایا۔ خیر اس کو بھی صبر کیا۔ تختی لکھتے لکھتے بھائی کو خط جانے لگے۔ اس کو بھی کسی طرح سہہ لیا۔ مگر یہ تو مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا کہ دوسرے کنبے تک بات پہنچے۔ خبردار! اب کوئی خط پتر صغرا کی سسرال گیا تو

مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہے۔ اِدھر دیکھو! تم سے کہتی ہوں!

سعیدہ۔ (میز جھاڑنا موقوف کر کے بے تعلقی کی نظر سے رقیہ کی طرف دیکھتی ہے۔)

رقیہ خاتون۔ میں دم بھر کے لئے تمہارا مزاج پوچھنے آئی تھی، یہاں آکر باتوں میں لگ گئی۔ ہاں، مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ محسن کا خط آیا ہے، وہ صغرا کو لینے آرہا ہے اور دوپہر کی گاڑی سے اترے گا۔ اگر تمھاری طبیعت ٹھیک ہو تو دوپہر اور شام کے کھانے کے لئے ٹھیک ٹھاک کر لو۔ لیکن جو جی نڈھال ہو تو خبردار کسی کام میں ہاتھ نہ لگانا! صغرا کو سمجھا دو، وہ سب کرلے گی۔

سعیدہ۔ جی نہیں، میری طبیعت اب بالکل صاف ہے۔

رقیہ خاتون۔ اچھا میں اب جاتی ہوں۔ مجھے صغرا کی لڑکی کے کرتوں میں پچکا ٹانکنا ہے۔ (چلی جاتی ہیں۔)

سعیدہ۔ اپنی کتابیں ترتیب سے رکھتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر میز کے خانے سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگتی ہے صغرا کمرے میں داخل ہوتی ہے اور سعیدہ کے ہاتھ میں تصویر دیکھ کر چپکے چپکے قدم رکھتے ہوئے اس کے پاس

پہنچ کر پیچھے سے جھانکنے لگتی ہے۔ سعیدہ ایسی محو ہے کہ اُسے مطلق صغرا کے آنے کی خبر نہیں۔)

صغرا۔ کیا پیارا چہرہ ہے!

سعیدہ۔ (چونک کر) اسے ہے۔ آپ بھی ڈرا دیتی ہیں بعض وقت صغرا بہن!

صغرا۔ سچ کہو کیسی چوری پکڑی ہے! نکلی نہ محمد علی کی تصویر؟

سعیدہ۔ ہاں، یہ تصویر بھائی جان یہاں بھول گئے تھے۔ اس وقت میز صاف کرتے میں سامنے آگئی تو میں نکال کے دیکھنے لگی۔

صغرا۔ (تصویر ہاتھ میں لے کر) بہت دن کے بعد یہ صورت دیکھی ہے۔ چچا جان کی زندگی میں ساتھ کھیلا کرتی تھی، مگر تب بچپنے کا چہرہ تھا اب اور ہی بات ہے۔ (سعیدہ سے) بھئی دولھا خوب ڈھونڈھ کے نکالا ہے! بڑی خوش نصیب ہو

سعیدہ۔ کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ کس کا دولھا، کہاں کی دلھن؟

صغرا۔ چلو بس باتیں نہ بناؤ! مجھے سب معلوم ہے۔ روزانہ خط لکھے جاتے ہیں، تحفے آیا جایا کرتے ہیں۔

سعیدہ۔ آپ خواب دیکھا کرتی ہیں، اور صبح اُٹھ کے بھولے

سے سمجھ لیتی ہیں کہ جاگتے میں دیکھا تھا۔

صغرا۔ یہ تصویر بھی تو خواب ہیں دیکھ رہی ہوں نا نہ؟ آخر تم انکار
کیوں کرتی ہو؟

سعیدہ۔ جب کوئی بات بھی ہو۔ آپ کو تو ہر وقت ہنسی سوجھتی ہے۔

صغرا۔ ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔ بھئی میں تو دل سے تمہاری خیر
خواہ ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ محمد علی سے شادی ہو۔ وہ
چکنی مٹی کا ڈھیر جو ادھ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

سعیدہ۔ بس ہو چکا۔ اب کوئی اور ذکر چھیڑیئے۔

صغرا۔ اچھا تمھارا مزاج کیسا ہے؟

سعیدہ۔ الحمدللہ، اچھی ہوں۔

صغرا۔ کیا اماں جان یہاں آئی تھیں؟

سعیدہ۔ ہاں، ابھی ابھی تشریف لے گئی ہیں۔

صغرا۔ نئی خبر تو سنا گئی ہوں گی؟

سعیدہ۔ ہاں کہتی تھیں دولہا بھائی آ رہے ہیں، مبارک ہو!

صغرا۔ بس رہنے بھی دو مبارک باد۔ یہ بھی معلوم ہے کاہے کے
لئے آ رہے ہیں؟

سعیدہ۔ آپ کو لینے۔ اسی لئے تو میں نے مبارک باد دی تھی۔

صغرا۔ یا اللہ! یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے کہ آدمی اپنا گھر چھوڑ کے پرائے گھر جائے؟

سعیدہ۔ پرایا گھر کیوں، آپ کا نہیں ہے؟

صغرا۔ اے ہاں، کیوں نہیں۔ ایسی ہی تو میری تقدیر ہے کہ راج کروں گی۔ بھلا خوش دامن صاحبہ کو خدا سلامت رکھے، ان کے ہوتے ہوئے میری کون ہستی ہے؟

سعیدہ۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دولھا بھائی اپنے والد کے انتقال کے بعد افسر خاندان ہیں، آپ ان کی بیوی ہیں، آپ کی کوئی ہستی نہیں؟

صغرا۔ بڑے افسر خاندان ہیں! ہر بات میں ماں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ وہ جو کہہ دیں، مجال نہیں اس میں بال برابر فرق آجائے۔ جو کچھ کماتے ہیں لاکر بی اماں کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں، وہی اندر باہر سب کا انتظام کرتی ہیں۔ میری وہ حیثیت ہے جو لونڈی کی ہوا کرتی ہے، پکانا، رندھنا، سینا پرونا یہ سب میرے متعلق ہے۔ یہ سب کچھ ہے اور یہ بندی منہ سے اُف نہیں کرتی۔ مگر جو چاہو کہ دشمنوں کو چین آجائے تو یہ ناممکن ہے۔ دنیا بھر کے الزام میرے سر تھوپے

جاتے ہیں، لڑکے کا دل ماں سے میں پھراتی ہوں، ساس
کا ادب میں نہیں کرتی، بدزبان میں ہوں، غرض کوئی
بُرائی ایسی نہیں جو مجھ میں نہ ہو۔ اور تو سب فرشتے ہیں۔

سعیدہ۔ پھر آپ ہی دیکھئے میں جو کہتی ہوں کہ مشترکہ خاندان فساد
کی بنیاد ہے تو آپ خفا ہوتی ہیں۔

صغرا۔ تم تو دنیا سے نرالی باتیں کرتی ہو! یہ میری تقدیر
ہے کہ ایسے ماں کے غلام سے پالا پڑا ہے، نہیں تو ایسی
اللہ کی بندیاں بھی ہیں جن کے میاں ان کے بس میں
ہیں۔ وہ گھر بھر میں راج کرتی ہیں اور ساس کو ناکوں
چنے چبوا دیتی ہیں۔

سعیدہ۔ وہ تو ایک ہی بات ہے۔ کہیں ساس بہو کو ستاتی ہے
کہیں بہو ساس کو، امن کسی گھر میں نہیں ہے۔

صغرا۔ تمہارے لئے ایک بات ہے، کوئی میرے دل سے پوچھے۔
اب رہا امن نہ ہونا تو یہ دنیا کا قاعدہ ہے، اس
کے لئے کوئی کیا کرے۔ جب تمہاری شادی ہو تو میاں
کو لے کر اپنا گھر ذرا الگ بنانا۔ (منظور داخل ہوتا ہے)

منظور۔ بھائی بندگی!

سعیدہ - آداب عرض ہے، بھائی جان!
منظور - کیوں سعیدہ طبیعت کیسی ہے؟
سعیدہ - الحمد للہ، بالکل اچھی ہوں - حرارت رات ہی کو جاتی رہی -
منظور - آج صاحب بہادر آرہے ہیں - معلوم ہوتا ہے ابھی یہاں
استقبالی کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا
صغرا - میں نہ کسی کا استقبال کرتی ہوں نہ کسی کی کمیٹی - یہ آپ
کی بہن صاحبہ مشترت...... مشترکہ خاندان کی
بحث کر رہی ہیں -
سعیدہ - بھائی جان، صغرا بہن اپنی ساس کی شکایت کر رہی تھیں
کہ گھر بھر پر حکومت کرتی ہیں، انہیں معطّل کر رکھا ہے اور
ان سے ہمیشہ لڑتی رہتی ہیں - میں نے کہا کہ یہ مشترکہ خاندان
کی خرابی ہے تو خفا ہوتی ہیں اور کہتی ہیں کہ دنیا کا قاعدہ ہے
کہ سب مل جل کر رہیں -
صغرا - آپ ہی کہئے میں کیا جھوٹ کہتی ہوں - دنیا جہان میں کون
شادی کے بعد الگ گھر کر کے بیٹھتا ہے -
منظور - پھر تم چاہتی کیا ہو آخر؟
صغرا - میں چاہتی ہوں کہ جس طرح خوش دامن صاحبہ مجھے بے گناہ

پرستم توڑتی ہیں خدا وہ دن لائے کہ میں بھی بتادوں بہو کیسی ہوتی ہے۔

منظور۔ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ساس بہو میں مخالفت کیوں ہوتی ہے؟

صغرا۔ میں دیوانی تو نہیں کہ غور کیا کروں۔ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔

منظور۔ اسی وجہ سے تو اور غور کرنا چاہیئے کہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے اور جو کوئی غور نہ کرے اسے بقول شیخ جی کے نہ خدا کی پروا ہے نہ اس کے دین کی اور نہ اس کی جو ہوتا ہے۔

صغرا۔ اچھا آپ ہی کوئی سبب بتائیے، آپ تو غور کرتے ہونگے۔

منظور۔ ساس بہو میں میل ساس کے بیٹے اور بہو کے شوہر کے سبب سے نہیں ہوتا۔ ایک طرف تو ماں، جو اپنے بیٹے کو بچپن سے بہ ہزار ناز و نعمت پالتی ہے اور اسے اپنی زندگی کا سہارا جانتی ہے، سمجھتی ہے کہ ایک غیر عورت نے آکر اس کے نورِ نظر کو اس سے چھین لیا۔ دوسری طرف بیوی جو اپنے عزیز و اقارب، گھربار چھوڑ کر اور ایک شخص کا

دامن تھام کر اسے اپنی زندگی کا شریک بناتی ہے کسی
طرح یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کا چہیتا کسی اور کو، خواہ
وہ ماں ہی کیوں نہ ہو، اس سے زیادہ عزیز رکھے، بلکہ
اسے اس سے بھی اذیت ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا اس
کے چہیتے کو خود اس سے زیادہ چاہے۔ انسانیت کی
نشو و نما کی ابتدائی حالت میں یہ تعلقات عداوت کا
پہلو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب نوعِ انسانی علم و تمدن کی
شاہراہ میں آگے قدم بڑھاتی ہے اور محبت کا مفہوم پاکیزہ
تر اور لطیف تر ہو جاتا ہے تو انسان اس سے جسے اس کا
محبوب چاہے یا جو اس کے محبوب کو چاہے بجائے عداوت
کے محبت کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوستان قوموں
کی ارتقاء کے ابتدائی زینے پر ہے اور بالخصوص یہاں
کی عورتیں تو حیوانوں سے ذرا ہی بہتر ہیں، اس پر طرہ یہ
ہے کہ مشترکہ خاندان کی بدولت ساس بہو ہمیشہ ایک
دوسرے کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ اس میں لڑائی کے
قدرتی ہیجان کو پوری طرح اظہار کا موقع ملتا ہے اور
ہر گھر میدانِ جنگ بن جاتا ہے۔

صغرا۔ یا اللہ بہن تو تمہیں ہی بھائی اور بھی فیلسوف نکلے۔ ان
تقریروں کا بھلا میں کیا جواب دے سکتی ہوں۔

منظور۔ اچھا اپنے شوہر جنگ بہادر کو آجانے دو۔ دونوں مل کر
مجھ سے بحث کرنا۔

صغرا۔ جی ہاں، وہ ضرور اپنی ماں کے مقابلے میں میرا ساتھ دیں
گے! یہ ہوتا تو پھر سارا رونا ہی کا ہے کا تھا۔

منظور۔ ماں کے مقابلے کا کیا ذکر ہے، میں تو مشترکہ خاندان
کے مسئلے پر علم عمرانیات کے نقطۂ نظر سے بحث کرنے
کو کہتا ہوں۔

صغرا۔ بھلا نقطۂ نظر سے بحث کر کے مجھے کیا مل جائے گا؟ آپ
سے کوئی اپنا درد دکھ بیان کرے تو آپ بجائے تسلی تشفی
کرنے کے اور اوپر سے نقطۂ نظر لے بیٹھتے ہیں۔

سعیدہ۔ (ہنس کر) بھائی جان کی اور آپ کی نہیں بنے گی۔ آپ
کو اپنی فکر ہے اور انہیں سارے جہان کی۔ آپ اپنی
ساس کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں اور بھائی جان دنیا بھر کی ساسوں
کا جھگڑا نپٹانا چاہتے ہیں۔

منظور۔ (مسکراتے ہوئے) بھئی صغرا یہ تمہاری زبردستی ہے کہ

تم سمجھتی ہو مجھے تم سے ہمدردی نہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ جن مشکلات میں تم مبتلا ہو انہیں میں تمہاری ہزاروں بہنیں گرفتار ہیں۔ اس لئے میں ان پر خصوصی نہیں بلکہ عمومی نقطۂ...... عام حیثیت سے غور کرتا ہوں، تمہاری ساس کچھ دنیا سے نرالی.......

صغرا۔ بس منظور بھائی یہی تو کہتی ہوں کہ آپ نہیں جانتے مجھے کس بلا سے سابقہ پڑا ہے۔ آپ کبھی خوش دامن صاحبہ کو دیکھیں تو معلوم ہو کہ دنیا سے نرالی ہیں یا نہیں۔ وہ ڈراؤنی شکل کہ خدا کی پناہ، ہتھنی کا سا ڈیل ڈول، بجّو کی سی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹھ، بالشت بھر کی ناک، پھر زبان کا یہ حال کہ میرا دل جانتا ہے، جھل فریب پور پور میں.....

منظور۔ بس بس رہنے دو صغرا، اب تم گالیوں اور کوسنے پر اتر آؤ گی۔ معلوم ہو گیا کہ تمہاری اور تمہاری ساس کی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ محسن کو آنے دو میں ان سے اس مسئلے پر گفتگو کروں گا۔

(خادمہ داخل ہوتی ہے)

خادمہ۔ سیدانی بی کہتی ہیں کھانا پکانا شروع کیجئے دیر ہو رہی ہے۔

صغرا۔ (اٹھتے ہوئے منظور سے) ہاں ہاں وہ آپ کی بات ضرور مانیں گے۔ میرے منظور بھائی خوب اچھی طرح کہئے گا۔ مگر ضرور بھول نہ جائیے گا۔

منظور۔ نہیں بھولوں گا۔

صغرا۔ (اٹھ کر) آؤ سعیدہ چلیں، بہت کام کرنا ہے۔

سعیدہ۔ آپ چلئے میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔

صغرا۔ دیکھو دیر نہ کرنا۔ (چلی جاتی ہے)

منظور۔ آج تو تمہارا سبق رہا، کل جمعہ ہے، پرسوں صبح کو پڑھنا۔

سعیدہ۔ کیوں بھائی جان، آخر سہ پہر کو فرصت نہ ہوگی؟

منظور۔ نہیں، آج کا دن تو سارا محسن کی نذر ہو گا۔

سعیدہ۔ بہت اچھا، مگر سنیچر کو ضرور۔ ہاں یہ تو بتائیے آپ نے جو نقشوں کی کتاب منگانے کا وعدہ کیا تھا۔

منظور۔ ہاں میں نے محسن کو لکھ دیا تھا وہ غالباً لائیں گے۔

سعیدہ۔ خدا کرے بھول نہ جائیں۔

منظور۔ اچھا اب تم جاکر کام کرو، صغرا انتظار کرتی ہوگی۔

سعیدہ۔ (اٹھ کر) آداب عرض ہے۔

منظور۔ جیتی رہو۔

(پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا ایکٹ

(ایک اونچی کرسی کا دالان ہے، تختوں کی چوکی پر سفید چاندنی بچھی ہے اور صدر میں قالین اور گاؤ تکیہ ہے۔ میر الطاف حسین تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک چھوٹی سی تپائی پر حقّہ رکھا ہے۔ تخت کے ایک سرے پر احمد حسین، ایک تکیئے دار مونڈھے پر شیخ کرامت علی اور دو کرسیوں پر محمد محسن اور منظور بیٹھے ہیں۔)

احمد حسین۔ دولھا میاں، سنا ہے کہ کلکٹر صاحب کی بدلی ہونے والی ہے۔

محسن۔ یہ خبر یہاں تک تو صحیح ہے کہ احکام صادر ہوگئے تھے بلکہ گزٹ بھی ہوگیا تھا لیکن اس کے بعد کی کارروائی لوگوں کو معلوم نہیں۔ وہ حکم منسوخ ہوگیا اور صاحب بدستور

یہاں رہیں گے

احمد حسین۔ آخر یہ کیسے؟ سنا کرتے تھے کہ گورمنٹی احکام نادری ہوتے ہیں اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلتے۔

محسن ۔ معلوم نہیں "رموز مملکت خویش خسرداں دانند"

احمد حسین ۔نہیں دولھا میاں آپ کو ضرور معلوم ہے مگر آپ بتانا نہیں چاہتے۔

محسن۔ نہیں صاحب میں کیا جانوں۔

احمد حسین۔ بس اب یہ باتیں رہنے دیجئے۔ آپ کو صاحب اور میم صاحب دونوں جتنا مانتے ہیں وہ کس سے چھپا ہے۔ بھلا کوئی بات ہے کہ انہوں نے آپ سے نہ کہا ہو؟

محسن۔ (مسکراکر) آپ سے کس نے کہا کہ صاحب مجھے مانتے ہیں؟ خیر اب آپ پوچھنا ہی چاہتے ہیں تو سنئے۔ دو ہفتے ہوئے میم صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ ناظر ہم بڑا پریشان ہے۔ صاحب کا بدلی ہونے کا حکم ہو گیا ہے اور ہم جانا نہیں چاہتا ہم کو یہاں کا آب ہوا بہت پسند ہے اور دوسرے اس ضلع کا زمیندار لوگ بڑا اشراف ہے۔

احمد حسین ۔ سچ کہئے یہ کہتی تھی میم صاحب؟

محسن۔ اور نہیں کیا میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں؟ خیر تو میم صاحب کہنے لگیں ناظر آپ کوئی ترکیب بتائیے کہ صاحب یہاں رہ جائے۔ میں نے کہا حضور یہ کتنی بڑی بات ہے۔ آپ کے اقبال سے آج ہی حکم تبادلہ منسوخ ہو جائے گا۔ بس حضرت وہاں سے آتے ہی میں شہر کے وکلا اور دوسرے معززین اور بااثر لوگوں سے ملا اور دو تار ایک ہندوؤں اور ایک مسلمانوں کی طرف سے لاٹ صاحب کو دلوا دیئے کہ محرم میں بلوے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اگر یہ کلکٹر صاحب یہاں نہ ہوئے تو خون ریزی کا اندیشہ ہے۔ شام کو بارگاہِ لفٹنٹی سے ارجنٹ تار پہنچا کہ تا حکمِ ثانی تبادلہ موقوف۔ یہ ہے سارا قصہ۔ مگر اسے اپنے تک رہنے دیجئے گا، اب تک سوائے چند لوگوں کے کسی کو خبر نہیں ہے۔ صاحب خود یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی فساد کا اندیشہ ہے۔ لوگوں سے دھڑا دھڑ مچلکے لے رہے ہیں۔

احمد حسین۔ کیوں نہ ہو دولھا میاں آخر آپ کس باپ کے بیٹے ہیں۔ آپ کے والد نے اپنی تحصیلداری کے زمانے میں ایک جنٹ کو بدلوا دیا تھا، آپ نے کلکٹر کو روک لیا۔

شیخ جی۔ واہ ناظر صاحب واہ! رام مورتی کو سنا کرتے تھے وہ موٹر
روک لیتا ہے، آپ نے کلکٹر کو روک کے دکھا دیا۔
میر صاحب۔ مگر سنو تو تم نے خلافِ واقعہ تار دلوایا تو گویا سرکار
کو دھوکا دیا۔
محسن۔ جی نہیں، دھوکے کی بات کیا ہے۔ محرم میں ہندو مسلمان
کی نزاع تو طے شدہ امر ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ ہمارے
صاحب جس طرح ان معاملات کو باحسن وجوہ سلجھا سکتے ہیں
اور کسی سے نہ بن پڑے گا۔
شیخ جی۔ ارے یہ کیا، اگر یہ سب سچ تھا تو آپ کی تعریف ہی کیا
ہوئی احمد حسین اسے حکمت عملی تھوڑی کہیں گے۔
احمد حسین۔ بس آپ کے نزدیک تو میں دنیا بھر کا جھوٹا ہوں اور
جھوٹوں کا قدردان۔
شیخ جی۔ نہیں توبہ کرو اگر تم جھوٹے ہوتے تو ہمارے میر صاحب
تمہیں اپنا سکریٹری امور دنیا کیوں بناتے اور کمزور مقدموں
والے تمہیں اپنی گواہی میں کیوں لکھایا کرتے (محسن سے)
ہاں صاحب تو آپ نے فقط سچا تار دے کے کلکٹر صاحب کو
روکا۔ خیر روک تو لیا۔

منظور۔ میاں محسن تم نے ضرور تار دلوایا ہوگا لیکن مسٹر فریزر کا تبادلہ منسوخ ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کی جگہ پر جو شخص آرہا تھا وہ دفعتاً بیمار ہوگیا۔ اور چھٹی لے کر انگلستان جانے والا ہے۔

محسن۔ تم سے یہ کس نے کہا؟

منظور۔ محمد علی نے۔ ان سے خود مسٹر فریزر سے باتیں ہوئی تھیں۔

محسن۔ بس معلوم ہوگئی حقیقت۔ ایسا ہی تو محمد علی کا کلکٹر سے یارانہ ہے۔

منظور۔ یارانہ کاہے کو ہونے لگا، ان دونوں میں تو ہمیشہ سے ان بن ہے۔ محمد علی نے جب سے کاشتکاروں کی انجمن قائم کی ہے سارے حکّام ان کے جانی دشمن ہیں۔ فریزر کا منشاء ان کو یہ خبر سنانے سے یہ تھا کہ تم میرے جانے سے بہت خوش تھے، اب سن لو کہ میں ٹلنے والا نہیں۔

محسن۔ کیسی بچپن کی باتیں کرتے ہو! حاکم ضلع دشمن ہوتا اور محمد علی ضلع میں رہنے پاتے۔ سب انجمن ونجمن رکھی رہتی اور صاحبزادے کو بوریا بدھنا سمیٹنا پڑتا۔

منظور۔ کیوں؟ حاکم ضلع کو اختیار ہے کہ جسے چاہے ضلع سے نکال دے۔

محسن۔ یوں اختیار نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہ سو بہانے سے باغیوں
کو کچل سکتا ہے۔
شیخ جی۔ مثلاً بقرعید کا مچلکہ لے کے۔
منظور۔ (غصے کے لہجے میں محسن سے) تمہارے نزدیک تو کلکٹر....
(محمد جواد کے داخل ہونے سے سب لوگ ادھر متوجہ
ہو جاتے ہیں اور سلسلۂ کلام منقطع ہو جاتا ہے)
احمد حسین۔ آئیے آئیے ہیڈ مدرس صاحب۔ کب سے آپ کا
انتظار ہے۔
محمد جواد۔ (نہایت جھک کر سلام کرتے ہیں) تسلیمات عرض ہے۔
ناظر جی کی خدمت میں آداب، (شیخ جی سے) بندگی، (احمد حسین
سے) مجرا، (منظور سے) کورنش۔
(سب لوگ سلام کا جواب دیتے ہیں)
میر صاحب۔ جیتے رہو، کہو آج تمہارے مکتب میں تعطیل ہے نہ۔
محمد جواد۔ اجی تعطیل کیسی قبلہ وکعبہ۔ ملازمان سرکاری اور خصوصاً
عمال سررشتۂ تعلیمات مغربی و شمالی کو تعطیل کہاں۔ پرسوں
ڈپٹی صاحب بہ غرض معائنہ تشریف لائیں گے۔ صبح سے
مصروف دوڑ دھوپ تھا، طالب علموں کو جمع کیا، مدرسے

کے سامنے کی گھاس چھلوائی، درجوں کے اندر زمین کو لپوایا،
دفعہ چار میں چوہوں کے بل تھے انہیں بند کرایا بہت سی
بنچیں گاؤں والے مانگ لے گئے تھے، ان سے واپس منگائیں
غرض بے انتہا عرق ریزش کے بعد اب مدرسہ اس قابل
ہوا ہے کہ خوشنودی حکام بالا دست کی حاصل کرے۔
"از خرداں خطا و از بزرگاں عطا"

شیخ جی۔ بلکہ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔

(میر صاحب مسکرانے لگتے ہیں اور محسن اور منظور بہ مشکل ہنسی
کو روکتے ہیں)

احمد حسین۔ سنا ہے ڈپٹی صاحب بہت سخت آدمی ہیں۔

محمد جواد۔ دیکھئے کیسے نکلتے ہیں۔ ناچیز کا تو ان سے پہلا سابقہ ہے
سب مدرسوں کو تاکید کر دی ہے کہ ایک سبق سب شاگردوں
کو اچھی طرح نوک بر زبان کرا دیں۔ اب تک تو ڈپٹی صاحبان
کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ ہیڈ مدرس کو حکم دیتے ہیں کہ سوال
کرے اور ہم لوگ اسی سبق میں سے پوچھتے ہیں جو لڑکوں کے
ذہن نشین پہلے سے ہوتا ہے۔

شیخ جی۔ کہیں پارسال کا واقعہ نہ ہو۔ جب انسپکٹر صاحب معائنے

کو آئے تھے آپ نے لڑکے سے کہا کہ برٹش حکومت کی برکات بیان کرو۔ وہ لگا قحط کے اسباب بتانے۔

محمد جواد۔ نہیں وہ تو اتفاقیہ بات تھی۔ وہ لڑکا کئی دن غیر حاضر رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سا سبق یاد کرایا گیا ہے کسی دوسرے ہم سبق سے پوچھا، اس نے اناپ شناپ بتا دیا جب میں نے پوچھا تو جو اسے یاد تھا سنانے لگا مگر اس دن بھی خیریت ہو گئی انسپکٹر صاحب رائے بہادر سے باتیں کر رہے تھے انہوں نے سنا نہیں ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔

شیخ جی۔ ہوتا کیا، لڑکے سے، اس کے ماں باپ سے اور آپ سے مچلکہ لے لیتے۔

محمد جوّاد۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا۔ میں نے صاحب کے جانے کے بعد دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی۔

شیخ جی۔ اور سچ کہیے ان کے آنے سے پہلے نماز خوف پڑھی تھی کہ نہیں؟

محمد جوّاد۔ یہ تو نہیں مگر جوشن کبیر میر صاحب سے لکھوا لے گیا تھا وہ بازو پر بندھا تھا۔

شیخ جی۔ تو اب کی مرتبہ ڈپٹی صاحب کے لیے جوشن صغیر لکھوا

لے جایئے۔

میر صاحب۔ شیخ جی آپ دنیوی باتوں میں چاہے جتنا مذاق کیجئے امور دین کا مضحکہ آپ کی بزرگی کے شایاں نہیں ہے۔

شیخ جی۔ میں ہیڈ مدرس صاحب سے ان کے مذاق کی باتیں کر رہا تھا، آپ کیوں دخل دیتے ہیں۔ آپ اعتراض کریں گے تو مجھے معقول جواب دینا پڑے گا اور اس سے میں حتی الامکان پرہیز کرتا ہوں۔

میر صاحب۔ آپ کو اس کا تو خیال کرنا چاہیئے کہ جب آپ ایسی باتیں کریں گے تو نوجوانوں پر کیا اثر پڑے گا۔

شیخ جی۔ انہیں نوجوانوں کی فکر تو میرے لئے کاہش جان ہو رہی ہے۔ یہ غریب بچپن سے مغربی عقلیت کے سائے میں پلے ہیں اور عقیدت و معرفت کی روشنی کو جو قلب کے ناپید اکنار صحرا میں بہت دور چمکتی ہے علم کی نزدیک بیں عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں اور جب کچھ نظر نہیں آتا تو کہتے ہیں یہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں، مگر قانون فطرت کے خلاف باوجودیکہ یہ روشنی بہت دور ہے اس کی حرارت قلب کے ہر حصّے میں محسوس ہوتی ہے اور اسی نے اہل مغرب کو

حیرت میں ڈال رکھا ہے کہ اگر روشنی نہیں ہے تو یہ حرارت
کیسی ؟ رہے ہمارے نوجوان تو ان کا علم اور شک دونوں
مانگے کے ہیں اس لئے انہیں یہ حیرت بھی نصیب نہیں۔ یہ تو
ہے ان کی حالت اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ کتابی مذہب کو
جس سے ان کم نگاہوں کو نظر ملنے کی امید ہو سکتی تھی
آپ لوگوں نے چھو منتر بنا رکھا ہے، مذہب کی حقیقت
قرار دی ہے عبادت ظاہری اور عبادت کا مقصد زندگی
کے ادنیٰ مقاصد کا حصول۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے دور رہیں
تو کون سے تعجب کی بات ہے۔

میر صاحب۔ مگر شیخ جی جو شنین کی فضیلت میں روایات صحیحہ
موجود ہیں۔

شیخ جی۔ بس رہنے دیجئے اپنی روایات صحیحہ۔

احمد حسین۔ (اٹھ کر) حضرت مجھ سے تو یہ کفر نہیں سنا جاتا۔ میں
تو رخصت ہوتا ہوں۔

محمد جواد۔ شیخ جی آپ کا سا بزرگ اور ایسی باتیں کرے، بڑے
تعجب کی جگہ ہے۔ میں آپ سے خرد سال ہوں لیکن اگر
حکم ہو تو منطق فلسفے سے خدا کا وجود ثابت کر دوں، دفعہ

سات کی سائنس ریڈر تک میں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا ہے۔
شیخ سعدیؒ کہتے ہیں.........اس وقت یاد نہیں آتا۔

شیخ جی۔ الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا۔

محمد جوّاد۔ نہیں وہ شعر اور ہے، "چوں" سے شروع ہوتا ہے۔

شیخ جی۔ بھئی میں تو چون وچرا سے خدا کے وجود کو نہیں ثابت کر سکتا۔ البتہ اگر ضرورت پڑ جائے تو خدا کے وجود سے چون وچرا کو ثابت کر دوں گا۔

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ حضور اندر سے کہلا بھیجا ہے کہ کھانا تیار ہے۔

میر صاحب۔ اچھا کہدو کہ آتے ہیں۔

(اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ منظور، محسن، احمد حسین اور جوّاد بھی)

میر صاحب۔ میاں محمد جوّاد تم بھی یہیں شیخ جی کے ساتھ کھانا کھاؤ، شام کو جانا۔

محمد جوّاد۔ نہیں قبلہ و کعبہ مجھے جانے دیجیے، بہت کام کرنا ہے۔

شیخ جی۔ اجی ٹھہرئے بھی آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف آئے گا۔ آپ کے ماتحت مدرسے میں لیپ پوت

کر لیں گے۔

احمد حسین۔ نہیں جواد میاں تمہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ میں کھانا بھیجتا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

(میر صاحب کے گھر کے زنانے حصے میں ایک دالان ہے جس میں تختوں کا چوکا بچھا ہے۔ اس پر اسی طرح کا فرش ہے جیسا مردانے میں میر صاحب کی نشست گاہ میں تھا۔ دالان کے ایک حصے میں دیوار سے لگی ہوئی ایک گھڑونچی ہے جس پر گھڑے اور ایک تپائی پر چند کٹورے رکھے ہیں۔ قالین پر محسن اور منظور تکیے سے لگے بیٹھے ہیں اور احمد حسین قالین کا ایک کونہ دبائے۔ چوکے کے پاس ایک نواڑ کا پلنگ ہے جس کے سرہانے بچھونا لپٹا ہوا رکھا ہے، اس سے تکیہ لگائے رقیہ خاتون بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں، پائینتی کی جانب صغرا بیٹھی پان بنا رہی ہے۔)

محسن۔ اماں جان، سعیدہ کھانا کھا کے کہاں غائب ہو گئی؟

رقیہ۔ اس کا جی اچھا نہیں تھا۔ میں نے کہا جا کر ذرا آرام کرے
مجھے اس لڑکی کی طرف سے بڑا اندیشہ ہے، سدا کی روگی ہو گئی
ہے اور دن بدن گھلی جاتی ہے اس پر گھنی اتنی ہے کہ دن بھر
میں اِنی گنی باتیں کرتی ہے اور اپنا حال کسی کو نہیں بتاتی۔
صغرا۔ میں تو تھوڑے دن سے یہ بات دیکھتی ہوں۔ چچا میاں
کی زندگی تک یہی سعیدہ بلبل کی طرح چہکتی تھی۔
محسن۔ آپ کو اس کی غذا کی طرف خاص توجہ کرنا چاہیئے۔ عورتیں
عموماً مردوں کے کھلانے کے اہتمام میں ایسی لگی رہتی ہیں کہ
اپنے کھانے کی انہیں مطلق پروا نہیں ہوتی۔ خراب اور
ناکافی غذا نہ صرف جسم کو توڑتی ہے بلکہ مزاج کو بھی بدل
دیتی ہے۔
احمد حسین۔ محسن میاں، یہ سچ ہے لیکن سب سے زیادہ ضروری
یہ ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے۔
محسن۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے۔
رقیہ۔ ہاں جوّاد کی ماں کا بھی اصرار ہے کہ جلدی کرنا چاہیئے۔
اب تم لوگ سوچ سمجھ کے تاریخ مقرر کرو۔
محسن۔ کیا جوّاد والی نسبت اب تک قائم ہے؟

رقیہ۔ اے اور نہیں تو کیا۔ شریفوں میں کہیں بندھی بندھائی نسبت چھوٹتی ہے۔

محسن۔ ہاں بلا سبب نہیں چھوٹنا چاہیئے لیکن جب معلوم ہو گیا کہ جوّاد کی ماں نے ان کی پہلی شادی پوشیدہ رکھی تھی اور جائداد کے معاملے میں دروغ بافی کی تھی تو آپ پر اس نسبت کی پابندی کب رہی۔

رقیہ۔ میاں تم بچے ہو۔ شادی بیاہ کے معاملے میں لوگ سچ نہیں بولا کرتے۔ یہ تو بیوپار ہے۔ ہر شخص اپنے مال کی سچی جھوٹی تعریف کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جوّاد کا بیاہ ایک بار ہو چکا ہے لیکن جب بیوی مر گئی تو وہ قصہ ختم ہوا۔ رہی جائداد، تو چودہ ہزار سال چھوٹ سہی مگر دو ہزار کے قریب تو جوّاد کو اپنی نانی سے ضرور ملے گی۔ پھر یہ دیکھو کہ ایسا خاندان کہاں ملے گا۔ اصل نسل سادات جن کی سات پیڑھی میں غیر ذات کا میل نہیں۔

محسن۔ اماں جان، آپ سعیدہ کی چچی ہیں، آپ سے بڑھ کر اس کا خیر خواہ کون ہو سکتا ہے، لیکن جب آپ میری رائے لیتی ہیں تو مجھ پر فرض ہے کہ اپنا سچا خیال ظاہر کر دوں۔ میں محمد جوّاد

کو ہرگز سعیدہ کا شوہر ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اوّل تو عمر میں تفاوت زیادہ ہے، دوسرے جوّاد کی علمی قابلیت اور دماغی تربیت بہت کم ہے، بلکہ بیچارہ عقل بھی واجی ہی واجی رکھتا ہے، تیسرے کسی اچھے عہدے پر مامور نہیں، ہیڈ مدرسوں کا گریڈ بہت کم ہے، ضلع کے دربار میں بھی نہیں جانے پاتے۔

صغرا۔ اور صورت شکل کے بھی صاحبزادے اچھے نہیں۔ میں نے سنا ہے طباق سا چہرہ ہے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔

رقیہ۔ یہ تو تم دونوں زبردستی کی باتیں کرتے ہو، میں نے کئی بار ڈیوڑھی سے جھانک کر جوّاد کو دیکھا ہے۔ اللہ رکھے پچیس کے لگ بھگ ہے اور اچھی خاصی آدمیوں کی سی صورت ہے۔

احمد حسین۔ اور یہ کیا کہا کہ قابلیت نہیں ہے۔ گیارہ مدرس اور ڈیڑھ سو لڑکے یوں ہی خواہ مخواہ ان کے تحت میں ہیں؟ رہا دربار، تو قصباتی لوگ کب دربار میں جایا کرتے ہیں۔ اور یوں جوّاد میاں کو پارسال مردم شماری کے کام کے صلے میں تحصیلدار صاحب نے اپنے ہاتھ سے سند دی تھی

جس پر کلکٹر کے دستخط تھے۔

محسن۔ آپ دونوں متفق ہیں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ لیکن میری نظریں تو کسی طرح یہ شخص نہیں جچتا۔ کیوں بھئی منظور تم کیوں چپ ہو؟ تم بھی تو اپنی رائے ظاہر کرو۔

منظور۔ مجھے رائے دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اس بحث ہی کو لغو سمجھتا ہوں۔

رقیہ۔ تم تو دنیا بھر کی باتوں کو لغو سمجھتے ہو۔ غضب خدا کا بہن کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں اور صاحبزادے انہیں لغو بتاتے ہیں۔

منظور۔ شادی کی باتیں مہمل نہیں مگر جس طریقے سے آپ اس کا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں وہ مہمل ہے۔

رقیہ۔ اور کون سا انوکھا طریقہ فیصلہ کرنے کا ہے؟

منظور۔ وہ یہ ہے کہ جس کی شادی ہو وہ خود فیصلہ کرے۔

رقیہ۔ بس رہنے دے لڑکے۔ میں یہ بے شرمی کی باتیں نہیں سننا چاہتی۔ جا کر اپنے اسکول میں تقریریں کر، شریفوں کے گھر میں...

محسن۔ ٹھہرئے اماں جان، آپ تو خفا ہو جاتی ہیں، ذرا مجھے کوشش کرنے دیجئے کہ میاں منظور کو سمجھاؤں۔ (منظور کی طرف مخاطب ہو کر) اس سے تو ہر روشن خیال آدمی کو اتفاق ہے کہ لڑکے

لڑکی کی شادی ان کی رضامندی سے کرنا چاہیئے۔ ان کی طبیعت کے خلاف انہیں مجبور کرنا سخت ظلم ہے۔ لیکن ان کے لئے بر ڈھونڈھنا تو والدین ہی کا کام ہے، کیونکہ شادی سے پہلے نہ تو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ بلا واسطہ کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

منظور۔ یہ کیا کم ظلم ہے کہ دولھا دلہن شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔

محسن۔ اچھا تو یہ کہیئے آپ بھی شیخ جی کی طرح پردے کے بہت مخالف معلوم ہوتے ہیں۔

منظور۔ بے شک ہر صحیح عقل کے آدمی کے لیئے پردے کا مخالف ہونا ضروری ہے۔

رقیہ۔ (محسن سے) دولھا میاں اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا، تم دونوں باہر سدھارو، وہاں شوق سے بحث کرنا۔ تم کو اصل معاملہ نہیں معلوم۔ یہ سب بحث مباحثہ ہے میاں محمد علی کی خاطر۔

منظور۔ اماں جان، سچ پوچھیئے تو آپ کو اصل معاملہ معلوم نہیں۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ جوّاد سے سعیدہ کی شادی کے اصل محرک لالہ سیتارام ہیں۔

رقیہ۔ کہنے والے کا کلیجہ، اور تم کو کیا کہوں، بھائی مرحوم کا خیال
کرکے رہ جاتی ہوں۔
(محسن سے) دولھا میاں تمہیں فرصت ہو تو سہ پہر کا ناشتہ بھی
آج گھر میں کرنا، اس وقت تم سے باتیں کروں گی۔ ساری
دنیا بکے جائے، مجھے ذرّہ برابر پرواہ نہیں ہے میں نے جو
دل میں ٹھانی ہے وہ کرکے رہوں گی۔
(محسن اور منظور اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

محسن۔ آداب عرض ہے۔

رقیہ۔ جیتے رہو۔

منظور۔ تسلیم عرض ہے چچی جان۔

(رقیہ منہ پھیر لیتی ہے۔ دونوں باہر چلے جاتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(میر صاحب کی نشست گاہ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔
شیخ کرامت علی اور محمد جوّاد انہیں جگہوں پر بیٹھے ہیں جہاں
ڈیڑھ گھنٹہ پہلے بیٹھے تھے۔ حقے کا دور چل رہا ہے)

جوّاد۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ لونڈے پڑھانے کی نوکری خوشی سے کرتا ہوں؟ بھئی نواب صاحب کی زبردستی سمجھئے کہ انہوں نے سعی و سفارش کر کے مجھے اس بلا میں پھنسا دیا۔ مجھے تو بچپن سے حدیث خوانی سکھائی گئی تھی۔ اس میں یہ مصیبت ضرور تھی کہ عربی کی آیتیں یاد نہیں رہتی تھیں، مگر ایسے ویسے مجمع میں تو فر فر پڑھتا تھا کہ صلوٰۃ کے نعرے سے آسمان ہل جاتا تھا۔ ع

"چیست دنیا خاکدانے کہنہ ویرانہ"

شیخ جی۔ آپ کی وہ ابتدائی تعلیم ہرگز بے کار نہیں گئی، میں نے

آپ کو پڑھاتے سنا ہے۔ انڈین پریس ریڈر کو بھی آپ خاص
لب و لہجے اور جزر و مد سے پڑھتے ہیں خصوصاً نون غنہ تو
اس جاں فرسا الحان کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ مجلس عزا کا
سماں یاد آتا ہے، اور رقّت بھی آپ کے درجے میں کافی ہوتی
ہے۔ اور نہایت خلوص سے۔

محمد جوّاد۔ شیخ جی آپ تو معلوم ہوتا ہے مذاق کرتے ہیں۔

شیخ جی۔ ہاں یہ میری بڑی بُری عادت پڑ گئی ہے۔ تمہارے ایسے متیں آدمی کو دیکھ کر خواہ مخواہ مذاق کرنے کو جی چاہتا ہے، اور یوں بھی میں ظرافت کو اچھا سمجھتا ہوں بشرطیکہ اس کے اندر بھی کچھ ہو۔

(منظور اور محسن داخل ہوتے ہیں)

محسن۔ اصل میں اندر عورتوں کے سامنے یہ بحث چھیڑنے کا موقع نہ تھا، اب یہاں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہو سکتی ہیں۔

منظور۔ محض بے کار ہے، آپ لوگوں سے بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

شیخ جی۔ کیوں خیر تو ہے، کاہے کی بحثا بحثی ہے؟

محسن۔ مجھ سے اور منظور سے پردے کے مسئلے پر بحث ہونے

والی تھی کہ اماں جان نے دونوں کو نکال دیا۔

شیخ جی۔ خیر پردے کی برکت سے آپ کو مردانے میں تو امن نصیب ہے۔ یہاں بیٹھ کر زبان آزمائی کیجئے۔

محسن۔ (منظور سے) تم جانتے ہو کہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں، اور پردے کی حمایت بھی مذہب کی بنا پر نہیں بلکہ معاشرتی اور اقتصادی وجوہ سے کرتا ہوں۔ ایک طرف تو ہنگامۂ زندگی کے جسمانی اور اخلاقی خطرات سے صنفِ نازک کو محفوظ رکھنے کے لئے پردہ ضروری ہے، دوسری جانب امورِ خانہ داری کا انجام دینا جو عورت کی قدرتی صلاحیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تقسیمِ محنت کے اصول پر اس کے حصے میں آیا ہے یکسوئی کے ساتھ اسی وقت ممکن ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری کو اپنی دنیا سمجھے۔

محمد جواد۔ اس میں کیا شک ہے "نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد"

منظور۔ جی درست ہے، ہنگامۂ ہستی ایسا ہی مدّھم تو ہے کہ اس کی صدا کو آپ کی چار دیواری روک لے گی اور اس کے جسمانی اور اخلاقی خطرات ایسے ہی کمزور تو ہیں کہ آپ کی چلمن سے ٹکرا کر واپس جائیں گے۔ اسے جناب یہ آندھی

کسی کے روکے رُکنے والی نہیں اور بفرض محال باہر سے آنے والے بگولوں کو آپ نے روک بھی لیا تو جو گھر کے اندر کی خاک سے اٹھتے ہیں ان کے لئے کیا کیجئے گا؟ اگر آپ انصاف سے کام لیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ زندگی کی مشکلات اور خطرات حرم سرا کے اندر بھی ہوتے ہیں، البتہ ان سے مقابلہ کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ رہے امورِ خانہ داری، تو یہ کہنا اور بھی اندھیر ہے کہ پردے میں بیٹھ کر یہ امور بہتر طریقے سے انجام دئے جا سکتے ہیں۔ بے شک تدبیر منزل کا مرکز گھر ہے، لیکن یہ مرکز بجائے خود بے معنی ہے اگر اس کے گرد ایک دائرہ دنیائے معیشت کا نہ کھینچا جائے اور مرکز نشین ذات پورے دائرے پر حاوی نہ ہو۔

محسن۔ یہی دلائل میم صاحب پردے کے خلاف پیش کیا کرتی ہیں میں انہیں تو جواب نہیں دے سکتا لیکن تم کو دیتا ہوں کہ گھر کے مرکز کے گرد بڑا سا دائرہ بنا کے یورپ کی عورتوں نے جو پیچیدگیاں تمدّن میں پیدا کر دی ہیں وہی تمہارے یہاں پیدا ہو جائیں گی۔

محمد جواد۔ جی ہاں اور چین کو دیکھئے، وہاں عورتوں کے پیر دبا دبا کے چھوٹے کر دیتے ہیں۔

منظور۔ (محسن سے) تمہارے دماغ پر تو یورپ مسلط ہے۔ تمہارے نزدیک اصلاح کے لئے قدم اٹھانا صرف اسی راستے پر ممکن ہے جس پر یورپ چلتا ہے۔ میرا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم یورپ کی مثال کو سامنے رکھ کر اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں یا عبرت نہ حاصل کریں۔ لیکن ہمیں ممالک یورپ اور ہندوستان کے فرق کو نہیں بھولنا چاہیے۔ تم کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یورپ میں پردہ پہلے بھی نہیں تھا، لیکن جن پیچیدگیوں کا ذکر تم کرتے ہو یہ زمانۂ حال میں پیدا ہوئی ہیں۔ یورپ کی بعض عورتیں مرکز سے محیط تک خطوط کھینچنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ چاہتی ہیں کہ مرکز اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ ظاہر ہے کہ پورے دائرے کی شکل بگڑ جائے گی۔ بالفاظ دیگر بعض عورتوں کا یہ خیال ہے کہ اُن کی زندگی کا مقصد اصلی صرف گھر کو گھر بنانا اور مردوں کو آدمی بنانا نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کی طرح کام کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ گویا فطرت کے خلاف پیامِ جنگ ہے اور زندگی شاہد ہے

کہ سوائے ان پیشوں کے جو امورِ خانہ داری اور تعلیم و
تربیت سے زیادہ بُعد نہیں رکھتے اور کسی میں عورتیں
مردوں کی طرح کامیاب نہیں ہوتیں اور تجربہ اُن کو
بہت جلد سکھا دے گا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ خیر یہ دُوسری
بحث ہے، مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ مشکلات
یوُرپ میں وہاں کے مخصوص تاریخی، معاشرتی، اقتصادی
حالات کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں اور ان کا پردہ نہ ہونے
سے لازمی تعلق نہیں ہے۔ چودہ صدی سے پہلے کی صدیوں
میں یورپ کو دیکھئے۔ پردہ وہاں نہیں تھا لیکن عورتیں
گھر کو اپنا مرکز سمجھتی تھیں اب بھی جو ممالک اور طبقات
صنعتی تمدن کی زہریلی ہوا سے مقابلۃً بچے ہوئے ہیں ان
میں یہ خرابیاں نہیں ہیں۔ ہندوستان کی اور قوموں
کو جن کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں دیکھئے۔ کیا ان کے گھر
برباد ہو گئے ہیں یا امورِ خانہ داری کو مرد انجام دیتے ہیں
محسن۔ خیر اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ پردے
کے ٹوٹنے سے وہ نظامِ معاشرت جو خاندان کے نام
سے موسوم ہے برباد ہو جائے گا تو بھی اس کا کیا جواب ہے

کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ رہتے ہیں جو ایک دوسرے پر اتنا اعتبار نہیں کر سکتے جتنا یورپ والے ایک قوم ہونے کے سبب سے کرتے ہیں۔

منظور۔ تم جیسے آدمی کو ایسی مہمل بات نہیں کہنا چاہیئے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کی اور قوموں میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ وہ ایک دوسرے پر اور مسلمانوں پر کیوں اعتبار کرتی ہیں؟ اور ان کے اعتبار کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوئیں ہیں جو مسلمانوں کو اُن کی تقلید کرنے میں عذر ہو؟

محمد جواد۔ تقلید تو سوائے مجتہد صاحب اجازہ کے کسی کی جائز نہیں واللہ اعلم بالصواب۔

محسن۔ اس وقت موقع نہیں ورنہ میں تمھیں بتاتا کہ کیا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔

لیکن تم یہ تو دیکھو کہ ہماری عورتیں خود جو پردے سے نہیں نکلنا چاہتیں انھوں نے اتنے دن کے تجربے سے اپنے گھر کے اندر رہ کر کام کرنا اور صبر و قناعت کے ساتھ ہنسی خوشی اپنی زندگی کے دن کاٹ دینا سیکھ لیا ہے اور انھیں یہ طرز زندگی چھوڑنے میں سخت دشواری ہوگی۔

منظور۔ ہاں اس میں مجھے تم سے اتفاق ہے۔ بے شک عادت نے ہماری عورتوں کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ وہ زندگی کی بہترین نعمتوں ہوا اور روشنی سے بے نیاز گھٹ گھٹ کر دق اور سل میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی ہیں اور ان کے لب پر کبھی شکایت نہیں آتی۔ لیکن کیا اس سے تم کسی مرض کی اچھائی ثابت کر سکتے ہو کہ مریض صبر و قناعت کا مجسمہ ہے؟ جن عورتوں نے کسی قدر تعلیم پائی ہے اگر تم انہیں اظہار رائے کا موقع دو اور سوسائٹی کے جبر و قہر میں ذرا تخفیف ہو تو تم دیکھو گے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکلنے کے لئے کس قدر تڑپتی ہیں۔

محسن۔ بھئی میں اپنی بات کی پچ کے لئے نہیں بلکہ ایمان سے کہتا ہوں کہ جہاں تک میرا تجربہ ہے ہمارے ہاں کی عورتیں پردہ توڑنا نہیں چاہتیں۔

محمد جواد۔ ناظر جی آپ بالکل بجا کہتے ہیں۔ اسی سال شروع جاڑے میں بہ حکم سرکار میں نے اضافۂ تعداد طالب علمان نسوانی کے لئے قصبے کا دورہ کیا اور دروازے دروازے پھرا۔ بنیچ قوم کے لوگ دو دو روپئے کے لالچ میں راضی

ہو گئے لیکن شرفا، میں بعض بعض نے تو پچاس بلکہ سو روپئے مانگے اور بعض نے صاف انکار کیا۔ مصلاح کار کہا من خرابی

محسن۔ شیخ جی آپ تو پردے کے بڑے مخالف ہیں، آپ نہیں کچھ بولتے؟

شیخ جی۔ بھائی میں کیا بولوں؟ آپ لوگوں نے ابتدا ہی سے مذہب کو بحث سے خارج کر دیا ہے۔ میں ٹھہرا بڈھا آدمی اور مسلمان۔ میرا دارومدار مذہب پر ہے۔

جواد۔ ہائیں شیخ جی، آپ اور مذہب۔ آپ جوشن کبیر کے قائل نہیں خدا کو مانتے نہیں اور کہتے ہیں مذہب پر دارومدار ہے۔

محسن۔ ہاں صاحب یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ میں تو آپ کو اب تک معقول پسند سمجھتا تھا۔

شیخ جی۔ آپ کا اس میں قصور نہیں ہے۔ آپ نے جو معنی مذہب کے سمجھے ہیں اس کے مطابق میں مذہب سے کوسوں دور ہوں۔

محسن۔ آخر آپ کے نزدیک مذہب کے کیا معنی ہیں؟

شیخ جی۔ کیا مختصر سا سوال جناب نے کر دیا ہے۔ ایک تو میں یوں ہی کیا کم گی ہوں دوسرے آپ بات وہ پوچھتے ہیں جس کی حقیقت کا تعین الفاظ میں ناممکن ہے اور جو ایک

نقطے کی طرح ہے جس کے گرد خیال پھرتا ہے لیکن اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کوشش میں جتنا بھی وقت صرف ہو کم ہے۔ خیر اس وقت مجھے وہ تقریر یاد آگئی جو مجھ سے اور اس عجیب و غریب پیر مرد سے ہوئی تھی جس کے ساتھ میں نے تمام ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اس نے مذہب کی جو تعریف کی تھی اُسے میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں تاکہ سر دست بحث کی بنا قائم ہو سکے کیونکہ ہر مسئلے کے متعلق میں صرف مذہب کے نقطۂ نظر سے رائے دے سکتا ہوں۔ یہ پھر کہے دیتا ہوں کہ یہ الفاظ مذہب کی ماہیت کو کسی طرح ظاہر نہیں کر سکتے، البتہ اگر سننے والا یہ پر اسرار کیفیت پہلے سے دل میں رکھتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ اس بگڑی ہوئی تصویر میں اصلیت کے خد و خال پہچان لے۔

محسن۔ جی ہاں، فرمائیے۔

شیخ جی۔ سنئے۔ قلبِ انسانی گوناگوں جذبات کا جلوہ گاہ ہے۔ جن میں سے ہر ایک کسی خاص چیز کے ادراک یا خیال سے برانگیختہ ہوتا ہے، کوئی چیز ہمارے دل میں خوشی

پیدا کرتی ہے، کوئی غم، کوئی نفرت، کوئی محبت، لیکن ایک
جذبہ ایسا ہے جس کے موضوع کا معین کرنا ہی نہیں بلکہ اس
کی نوعیت کا بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ جذبہ شاذونادر
ہی مشتعل ہوتا ہے، لیکن جب ہوتا ہے تو ہمارے سارے
وجود پر چھا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارے دل پر زندگی
کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات
بجلی کی لہر کی طرح ہماری رُوح میں دَوڑ گئی۔ عام لوگوں
پر اس کا اثر محض آنی اور بہت ہلکا ہوتا ہے اور وہ نہ
تو اس واردات کو خود سمجھ سکتے ہیں نہ الفاظ میں بیان
کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض برگزیدہ ذاتیں اس جذبے کی
حرارت کو اس درجے تک محسوس کرتی ہیں کہ وہ اس
سے عالم معنی اور عالم صورت میں شمعیں روشن کر دیتی
ہیں جن کی روشنی میں (ان مقدس لوگوں کی بدولت)
دوسرے بھی زندگی اور کائنات کو دیکھ اور سمجھ سکتے
ہیں اور جن کی گرمی سے خود اپنے قلب کی حرارت کو
تازہ کر سکتے ہیں۔ ایسی ایک قندیل روشن کی تھی رسول
ہاشمیؐ نے جس کی روشنی سے دُنیا تیرہ سو سال سے جگمگا رہی

ہے۔ لیکن ایک تو تنگ نظری اور تعصبات کی گرد اس قندیل پر جم گئی ہے جس سے اس کی روشنی ماند پڑ گئی ہے دوسرے لوگ اس کی خارجی گرمی پر اکتفا کر کے خود اپنے قلب کی حرارت سے غافل ہو گئے ہیں۔ تیسرے سب سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ لوگوں نے اس کے نور کو دیکھنے کے لئے ساری دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں چنانچہ شمع کے روشن کرنے والے کا مقصد اس کی روشنی میں حیات اور کائنات کو دیکھا جائے تو فوت ہو گیا ہے۔ بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ جس شخص نے اس شمع کے گرد کی فضا کو نہیں دیکھا اس نے گویا خود یہ شمع نہیں دیکھی۔

محمد جواد۔ شیخ جی میری خطا معاف کیجئے۔ میں آپ کو لا مذہب سمجھتا تھا آپ نے اس وقت وہ وعظ کہا ہے کہ سبحان اللہ۔ مگر پچھ بہت بتا میں نے اگرچہ سکندر نامے تک پڑھا ہے لیکن سوا اس کے اور کچھ نہیں سمجھا کہ محفلِ میلاد اور شمع کی روشنی کا ذکر تھا۔ "بلغ العلیٰ بکمالہ۔ کشف الدجیٰ بجمالہ"

محسن۔ اگر مذہب ایسا ہے جیسا آپ نے کہا تو بہت اچھی چیز ہے لیکن پردے کی بحث سے اس کو کیا تعلق ہے؟ عورتوں

کو پردے میں بیٹھ کر مذہبی کتابوں کے پڑھنے سے تو کسی نے نہیں روکا۔

شیخ جی۔ پردے سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ مجھے پردے سے بڑی شکایت یہ ہے کہ اس نے عورتوں کو مذہب کی تکمیل سے باز رکھا ہے۔ میرے خیال میں عورتیں مردوں کی طرح، بلکہ شاید مردوں سے زیادہ، یہ صلاحیت رکھتی ہیں کہ صحیح مذہب کے نور سے منور حیات اور کائنات کا نظارہ کر کے اس کی حرارت کو حواس ظاہری اور باطنی کی مدد سے جذب کر لیں اور اس طرح اس خفی آگ کو پھر مشتعل کریں جو مذہب کی اصل اور زندگانی کا مدعا ہے لیکن جہالت کا خدا برا کرے جس نے عورتوں کو اس قید فرنگ میں ڈال رکھا ہے جہاں وہ میاں منظور کے الفاظ میں لیکن دوسرے معنی میں روشنی اور ہوا کی آرزو میں تڑپ تڑپ کر جان دیتی ہیں۔ آپ نے بجا کہا کہ بعض گھروں میں جہاں عورتوں کو تھوڑا بہت لکھنے کی اجازت ہے وہ مذہبی کتابیں پڑھ سکتی ہیں، لیکن عزیز من مذہب کا جو مختصر سا خاکہ میں نے پیش کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ کتابوں

میں بند ہونے والی چیز نہیں ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو تمام
عالم پر طاری اور تمام زندگی میں ساری ہے اور جس کے
احاطے کے لئے انسان کو لازم ہے کہ زمان و مکان کی
بڑی سے بڑی وسعت میں جو اسے میسر آسکے ہر چیز کو
اسی خاص روشنی میں جس کا ذکر ہو چکا ہے دیکھے، پرکھے
سوچے اور اگر ممکن ہو تو سمجھے۔

محمد جواد۔ واہ صاحب، کہاں مذہب کا ذکر تھا کہاں ......

منظور۔ شیخ جی میں چاہتا ہوں کہ اب یہ سلسلۂ گفتگو ختم کیا جائے۔
آپ کی تقریر سننے کے بعد اب دوسروں کا ہر لفظ مجھ پر
گراں گذرے گا۔

شیخ جی۔ ہاں بھائی میں بھی شل ہو گیا۔ بیٹھنے کی طاقت نہیں۔ اب
ذرا جا کر آرام کروں گا۔

(اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پردہ گرجاتا ہے۔)

تیسرا ایکٹ

پہلا سین

(ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں صرف ایک دروازہ ہے اور دو روشن دان۔ آدھے کمرے کو ایک چارپائی گھیرے ہوئے ہے، بقیہ حصے میں ایک چھوٹی سی چوکی ہے جس پر بے ترتیبی سے خطوط اور دوسری چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک طرف دیوار کے اندر ایک تین خانوں کی الماری ہے، ہر خانے میں کتابوں کے ڈھیر ہیں۔ دو کھونٹیوں پر دو اچکنیں اور ایک عمامہ لٹکا ہوا ہے پلنگ کے پاس ایک تپائی پر چند دواؤں کی شیشیاں گلاس، تھرما میٹر وغیرہ رکھے ہیں۔ دو کرسیاں چارپائی کے پاس بچھی ہیں، ایک خالی ہے دوسری پر منظور بیٹھا ہے۔ شیخ جی رضائی اوڑھے چارپائی پر لیٹے ہیں)

منظور۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بخار اتر گیا۔ کل ڈاکٹر کہتا تھا کہ اگر دو دن اور یہی حال رہا تو بہت اندیشے کی بات ہے۔

شیخ جی۔ (نحیف آواز میں) ہاں بھائی کمبخت تپ نے علاوہ میری ہڈیوں کو پھونک ڈالنے کے تم کو اور تمھاری بہن کو بہت تکلیف دی۔ چھ دن سے دونوں کا سارا وقت میری پٹی سے گزرتا ہے۔

منظور۔ نہیں شیخ جی، انصاف سے پوچھئے تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا، ساری تیمارداری سعیدہ کرتی تھی۔ میں تو بیٹھا ہوا کتاب پڑھا کرتا تھا۔

شیخ جی۔ یہ تیسرا موقع ہے کہ سعیدہ کی تیمارداری نے میری جان بچائی ہے .... (کچھ دیر کے بعد) خدا جانے کیا بات ہے کہ مجھے اس بیماری میں تمھارے والد مرحوم بہت یاد آئے۔ تم دونوں کو اکثر میں شجاعت ہی کے نام سے پکارتا تھا۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں ہذیاں بک رہا ہوں یا بخار نے مرحوم کی خیالی شکل میرے سامنے پیش کر دی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کو خوب پہچانتا تھا پھر بھی جی یہ چاہتا تھا کہ تمھیں اسی نام سے پکاروں۔

(خادمہ داخل ہوتی ہے)

خادمہ۔ منظور میاں چھوٹی بٹیا پوچھتی ہیں کہ کوئی اور نہ ہو تو میں آؤں

منظور۔ ہاں کہہ دو چلی آئیں

شیخ جی۔ اچھا ہے سعیدہ کو بھی آجانے دو۔ آج میرا تم دونوں سے

کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

منظور۔ مگر آپ کمزور بہت ہیں، ڈاکٹر نے کہا ہے کہ زیادہ باتیں

نہیں کرنا چاہیئے

شیخ جی۔ ڈاکٹر کا بہت بہت شکریہ، مگر میں مجبور ہوں ستر برس سے

باتیں کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔

(سعیدہ داخل ہوتی ہے)

سعیدہ۔ آداب عرض ہے شیخ جی، کہئے اب طبیعت کیسی ہے؟

شیخ جی۔ جیتی رہو بیٹی۔ اب بالکل اچھا ہوں۔ البتہ بخار سے کتنی

جیت لینے کے بعد ذرا ہانپ رہا ہوں۔

سعیدہ۔ یہ لیجئے آپ کے لئے تھوڑا سا انار کا افشردہ لائی

ہوں، اسے پی لیجئے۔

شیخ جی۔ اچھا ذرا ٹھہر کر پیوں گا، ابھی دوا پی ہے۔ اسے چوکی

پر رکھ دو۔

(سعیدہ پیالہ چوکی پر رکھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سعیدہ۔ چچا جان نے آپ کا مزاج پوچھا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر خود بھی تشریف لائیں گے۔

شیخ جی۔ خدا انھیں جیتا رکھے، دنیا میں تم دونوں کے بعد اُن کی ذات سے مجھے اُنس ہے۔ تمھارے باپ نے بستر مرگ پر انھیں میری خبر گیری کی تاکید کی تھی، بیچارے کو اس کا ہر وقت خیال رہتا ہے۔ باوجودیکہ خاندان میں عضو معطل ہیں لیکن جب کوئی میری مخالفت کرتا ہے تو ان سے نہیں سنا جاتا۔ خدا کی شان ہے اپنوں نے میرے ساتھ کیا کیا اور ایک غیر شخص میرے ساتھ کیا کر رہا ہے (کسی قدر وقفے کے بعد) تم دونوں سے میں نے ...... اپنی ابتدائی زندگی کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ آج جی چاہتا ہے کہ تمھیں اپنی کہانی سناؤں بشرطیکہ تمھیں ناگوار نہ ہو۔

منظور۔ بہت شوق سے، مگر ڈاکٹر......

سعیدہ۔ شیخ جی آپ ڈاکٹر کو بکنے دیجیے اور جی کھول کر باتیں کیجیے مگر چپکے چپکے اور ٹھہر ٹھہر کر۔

شیخ جی۔ رسم کے مطابق میں بھی اپنے قصے کو غدر کے بعد سے

شروع کرتا ہوں۔ ۱۸۵۸ء میں ایک دُور و دراز قصبے کے
زمیندار کا اکلوتا لڑکا سترہ برس کا تھا۔ یہ لڑکا قرب وجوار
میں شرارت اور شورہ پشتی میں مشہور تھا۔ آم اور امرودوں
کے باغوں میں چھاپہ مارنے اور اپنے ہم عمر لڑکوں کو مارنے
پیٹنے میں اُس کا نظیر دُور دُور نہ تھا گاؤں کے بڈھے اس
کی حرکتوں کا ذکر سُن کر مسکراتے تھے اور کہتے تھے کہ
اس لڑکے میں بچپن سے زمینداری کی شان ہے۔ (سعیدہ
منظور کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے) مگر اس کی ایک بات
سے ہر شخص خائف اور متردّد تھا۔ اُسے پڑھنے کا بہت
شوق تھا۔ حالانکہ مولوی صاحب جو اس کے پڑھانے پر
نوکر تھے اور جن کی افیون اور حقّے میں وہ کبھی کوتاہی نہیں
کرتا تھا اس کا اطمینان دلایا کرتے تھے کہ اسے اس سے
زیادہ پڑھنے میں انہماک نہیں جتنا کہ ایک زمیندار کے
بچّے کو ہونا چاہیے مگر گاؤں بھر جانتا تھا کہ یہ قریب کی
گوروں کی چھاؤنی میں جا کر ایک بنگالی بابو سے انگریزی
پڑھا کرتا ہے۔
سعیدہ۔ اِس بنگالی کا نام مہندر بابو تھا۔

شیخ جی۔ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بخار میں یہ نام میری زبان پر تھا۔
خیر اپنے باپ سے چھپا کر یہ لڑکا انگریزی مہندر بابو سے،
جو بنگالی ہونے کے سبب سے جادوگر مشہور تھے، اور
فارسی بطور خود پڑھا کرتا تھا۔ اس سبب سے لوگوں کو نہ
صرف اس کی زمینداری بلکہ اُس کی آدمیت میں بھی شبہ
ہونے لگا، یہاں تک کہ آخر میں بالکل ظاہر ہوگیا کہ یہ
لڑکا دین دنیا سے گذر گیا ہے۔

منظور۔ کیوں کیا اُس نے مڈل پاس کر لیا؟

شیخ جی۔ نہیں۔ اس کا باپ اس کی شادی ایک نہایت معزز اور
امیر گھرانے میں کرنا چاہتا تھا، مگر اس بدنصیب نے
انکار کر دیا اور جب باپ نے تشدّد کرنا شروع کیا
تو بائیس برس کی عمر میں گھر چھوڑ کر تن بہ تقدیر نکل کھڑا ہوا۔

منظور۔ آفریں ہے اس کی ہمت کو۔

سعیدہ۔ اس لڑکی میں کیا خرابی تھی؟

شیخ جی۔ کوئی نہیں، سوائے اس کے کہ وہ دیوانی تھی۔ جبھی تو
عرصے تک یہ لڑکا ہندوستان کے مختلف حصوں میں مارا
مارا پھرتا رہا اور زیادہ تر زمینداروں کے لڑکوں کی

اتالیقی کرکے پیٹ پالتا رہا۔ اس نوکری میں اُسے ہر طرح کا
آرام تھا، اعلیٰ درجے کے خدمت گار کی حیثیت سے ہر خاندان
میں رہتا تھا، کھانے کپڑے کے علاوہ آٹھ آنے سے لے کر
دو روپے مہینے تک تنخواہ ملتی تھی اور کام کچھ نہیں تھا۔ مگر
مزاق کا خدا بھلا کرے۔ اس شخص کو سب کہیں شہر کا اندیشہ
لگا رہتا تھا۔ کہیں زمینداروں کی جہالت سے نالاں تھا،
کہیں کاشتکاروں کے ساتھ اُن کے ظلم کا شاکی۔ بارہ تیرہ
برس کی گردش کے بعد یہ شخص ایک ایسے خاندان میں پہنچا
جو اُسے ہر طرح پسند تھا اور اس کے سپرد ایک بچہ کیا
گیا جس کا سا ذہین اور ہونہار شاگرد اس معلم کو کبھی نہیں ملا تھا
سعیدہ۔ اس زمانے میں کیا عمر تھی ابا جان کی؟
شیخ جی۔ دس سال کی۔ اس لڑکے کو پڑھانے میں اتالیق کو معلوم
ہوا کہ معلمی کیا دلفریب پیشہ ہے۔ غنچے کو کِھل کر پھول بنتے
ہوئے دیکھنے سے اور اس کی شمیم نسیم سحری کی مدد سے
سونگھنے سے باصرہ اور شامہ کو وہ فرحت حاصل نہیں ہوتی
جو ایک ننھی سی جان کو اپنے ماحول میں پھیلتے اور بڑھتے
ہوئے دیکھنے سے اور اس میں معاون ہونے سے روح

کو حاصل ہوتی ہے۔ قصہ مختصر اب اِس اتالیق کو زندگی کا ایک مصرف مل گیا۔ شاگرد کے خداداد جوہر شفیق استاد کی مدد سے خوب چمکے۔ لڑکے نے اسکول کی پڑھائی کامیابی کے ساتھ ختم کی، کالج میں داخل ہوا اور وہاں بھی اپنی قابلیت کا سکّہ طالب علموں کی دنیا میں جما دیا۔

منظور۔ میں نے بعض دشمنوں کی زبانی سُنا ہے کہ کالج میں اُس لڑکے کی زندگی عیوب اور نقائص سے بَری نہ تھی۔

شیخ جی۔ بچّے تختی لکھنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔ فرض کرو کوئی اس تختی کو اُٹھا رکھے اور جب یہ بچّے پڑھ لکھ کر فاضل ہو جائیں تو انھیں اُن کی غلطیاں دِکھا کر شرم دلائے۔ ایسے شخص کو میں اُن لوگوں کے مقابلے میں کم احمق اور بد باطن سمجھتا ہوں جو ایک پسندیدہ سیرت کے مالک کو اس کی اُن خطاؤں کا طعنہ دیں جو اس سے آدمی بننے کی کوشش میں سرزد ہوئی تھیں۔

سعیدہ۔ آپ تو اپنی کہانی کہیے اور اِس ذکر کو چھوڑیے۔

شیخ جی۔ لڑکے نے کالج سے اِعزاز کے ساتھ سند حاصل کی اور اُسے حوصلہ پیدا ہوا کہ یورپ میں جا کر مزید تعلیم

حاصل کرے اور اپنی زندگی کو علمی کاموں کے لئے
وقف کردے۔ لڑکے کے خاندان کو اس کا اسکول
اور کالج میں جانا ہی ناگوار گزرا تھا، یورپ کے نام پر تو
قیامت ہی برپا ہوگئی۔ لیکن لڑکا اپنی دھن کا پکا تھا،
اُس کا عزم ساری مخالفتوں پر غالب آیا اور اس نے
یورپ کی راہ لی۔ استاد پر عزیز شاگرد کی روانگی کے
بعد زندگی دو بھر ہوگئی۔ اگرچہ اب اسے اتالیق کی حیثیت
سے بہت شہرت حاصل ہوگئی تھی اور گرد و نواح کے
اکثر رئیس اپنے لڑکوں کی تعلیم اس کے سپرد کرنا چاہتے
تھے لیکن اس نے سب سے انکار کر دیا۔ آخر جب اس
نے دیکھا کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا تو وحشت کے ہاتھوں
مجبور ہو کر یہ دل میں ٹھان لی کہ ہمالیہ ہوتا ہوا تبت جاکر
اپنی زندگی کوہ نوردی اور دشت پیمائی میں گذارے۔
چنانچہ ایک دن صبح تڑکے اس نے اپنے اسباب میں سے
دو جوڑے کپڑے لے کر ایک گٹھری میں باندھے اور پیٹھ
پر رکھ کر نکل کھڑا ہوا۔

اُسے منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے دس بارہ

دن ہوئے تھے کہ راہ میں ایک پیر مرد ملے جو زبردستی
اُس کے رفیق سفر بن گئے۔ ابتدا میں تو جوان اتالیق
کوشش کرتا رہا کہ اس بڈھے سے کسی طرح پیچھا چھڑائے
لیکن ایک طرف تو اُس کی وحشت آہستہ آہستہ کم
ہو رہی تھی دوسری طرف اُس کے ساتھی کا اثر اُس پر
بے اُس کے محسوس کئے ہوئے پڑ رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز
کے بعد دونوں میں گہری دوستی ہو گئی اور ہمارا اتالیق اپنے
پہلے ارادے کو ترک کر کے پیر مرد کے ساتھ عرصۂ دراز تک
سفر کرنے کے لئے راضی ہو گیا۔ پیر مرد نے اس سے یہ
شرط کی کہ پہلے دونوں کوہ و صحرا کا خیال چھوڑ کر بستیوں
اور شہروں کی سیر کریں۔ اس کے بعد اگر جوان کو کوہ ہمالیہ پر
چڑھنے کی ہوس باقی رہے تو پیر مرد بھی اس کا ساتھ دے گا۔
سعیدہ۔ خوب شرط کی پیر مرد نے۔ میں بھی ہوتی تو یہی کرتی۔
شیخ جی۔ چار برس میں ان دونوں نے سارا ہندوستان پورب
سے پچھم تک اور اُتر سے دکھن تک چھان ڈالا۔ اس سفر
میں انھوں نے لہراتے ہوئے دریا، شاداب وادیاں،
لہلہاتے ہوئے کھیت دیکھے اور فاقہ کش مرد بے زبان

عورتیں اور بیمار بچے۔ انھوں نے سر بفلک محل اور عالیشان
مکان دیکھے اور ان کے جاہل اور عشرت پسند مکیں، عشرت
رفعت مسجدوں اور مندروں کو دیکھ کر انھیں خدا یاد آگیا
ایمان سے خالی نمازیوں اور پجاریوں کو دیکھ کر ان کے
دل ٹوٹ گئے۔ دلفریب زمین اور بدبخت انسانوں، قابل
فخر ماضی اور شرمناک حال کے ان نظاروں اور روشن ضمیر
پیرمرد کی صحبت کا اتالیق پر عجیب اثر پڑا۔ اس کی طبیعت
کی بےچینی اور بے مرکزی کافور ہوگئی اور اس کا دل ایک
نئے درد سے معمور ہو گیا جو صحرا نوردی کا نہیں بلکہ آبادی
میں رہنے کا، ہمالیہ میں جاکر خود کو کھو دینے کا نہیں بلکہ
انسانوں سے مل کر اپنے آپ کو پا لینے کا متقاضی تھا۔ پیر
مرد تو اس سے رخصت ہو کر اپنے دائمی سفر پر روانہ ہو گئے
اور وہ اپنے شاگرد کی واپسی کی خبر سن کر اس کے گھر پہنچا تاکہ
اسے اپنے نئے جذبات و خیالات کا شریک بنائے۔
یہ اتفاق دیکھو ادھر شاگرد بھی یورپ سے وہی چوٹ
لے کر آیا تھا جو استاد نے ہندوستان میں کھائی تھی۔ اس
نے یورپ میں اپنا وقت بے کار نہیں کھویا تھا بلکہ وہاں کے

تمدن کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُس کی ظاہری آنکھیں جس قدر وضاحت سے یورپ کو دیکھتی تھیں اسی قدر اس کی چشم بصیرت کے آگے ہندوستان کے اصلی خد و خال نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ ہندوستان کے اس نئے مرقع میں اسے بہت سے دردناک مناظر نظر آئے لیکن سب سے زیادہ قابل رحم اس نے عورتوں کی حالتِ زار کو پایا۔ چار برس کے بچھڑے استاد و شاگرد ملے۔ دونوں نے اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو سنائی اور مہینوں مشورے ہوئے جن میں شاگرد کی بیوی بھی شامل ہوا کرتی تھی۔ یہ نیک بیوی کچھ دن کے بعد ایک بچہ اور ایک بچی چھوڑ کر راہیِ جنت ہوئی مگر استاد اور شاگرد نے اپنی زندگی کو عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے لئے وقف کرنے کا قصد کر لیا۔ (ذرا ٹھہر کر) اس کے بعد کا قصہ تمھیں معلوم ہے کہ کس طرح دونوں نے اپنی قوم کے تعصب اور جہالت کا مقابلہ کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ شاگرد کو موت دنیا سے لے گئی اور استاد کو بڑھاپے نے ہر کام سے معذور کر دیا۔

منظور۔ کاش ہمارے ملک میں اور چند افراد ایسے ہوتے ،
کاش ....

سعیدہ۔ شیخ جی آپ پیاسے ہوں گے۔ (پیالہ اٹھاکر) لیجئے اب
پی لیجئے۔ (شیخ جی اُٹھ کر افسردہ بیٹتے ہیں)

شیخ جی۔ بیٹی خدا تمھاری عمر میں برکت دے۔ آنکھیں کھل گئیں

سعیدہ۔ آپ کا قصہ میں نے بہت جی سے سُنا۔ اس سے دل بھی
دکھا اور خوشی بھی ہوئی۔ آپ سے ایک بات پوچھنے کو جی
چاہتا ہے۔

شیخ جی۔ شوق سے پوچھو۔

سعیدہ۔ آپ کے نزدیک ہم عورتوں کی حالت کبھی بدلے گی
یا نہیں ؟

شیخ جی۔ بیٹی ، میری عمر کا اور اس وقت کی حالت کا تقاضا تو یہ
ہے کہ لال بجھکڑ کی سی صورت بنا کر اور سر ہلا کر کہوں کہ
"مبادا ازیں بتر گردد" لیکن نئی نسل میں تمھاری سی لڑکیاں
اور تمھارے بھائی کے سے لڑکوں کو دیکھ کر مجھے امید ہوتی
ہے کہ جلد اچھے دن آجائیں گے۔

منظور۔ شیخ جی آپ کی محبت ہے کہ آپ ہم دونوں کی نسبت

ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ میں آپ کی تعریف کی دل سے
قدر کرتا ہوں، لیکن اس سے بھی زیادہ احترام آپ کی
تنقید کا میری نظر میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی گفتگو
کے سلسلے میں آپ ہمیں ان خامیوں سے آگاہ کر دیں جو
آپ کو ہم لوگوں کے طرزِ عمل میں نظر آئیں۔

شیخ جی۔ میرے خیال میں تم نوجوانوں میں دو بڑے نقائص ہیں،
ایک تو یہ کہ تم لوگوں میں جوش عزم سے زیادہ ہے، دوسرے
جیسا تمھارے سوال سے ظاہر ہوتا ہے تم لوگ نکتہ چینی
کو ضرورت سے زیادہ اہم سمجھتے ہو۔

منظور۔ پہلا اعتراض تسلیم، لیکن دوسرا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ
کا ایسا سخت گیر ناصح نکتہ چینی کا مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟

شیخ جی۔ ہاں میاں، میں بھی ایک زمانے میں زبان کی کاٹ کا
بہت معتقد تھا، اسی زمانے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے
بڑھاپے میں بسیار گوئی کے ساتھ اعتراض کرنے کا مادہ
اور بڑھ گیا ہے، لیکن جس غلطی میں میں مبتلا ہوں اس سے تمھیں
بچانا چاہتا ہوں۔ تمھارے حریف زیادہ تر بڈھے لوگ ہیں
اور یہی زیادہ تر تمھارے ہدفِ ملامت ہوتے ہیں، لیکن

انصاف سے دیکھو تو ان لوگوں پر اعتراض کرنا بالکل بے جا
ہے۔ انھوں نے اس تاریک خیالی کے زمانے میں پرورش
پائی ہے جس کا تم آجکل کی پستی کو دیکھ کر بھی اندازہ نہیں
کرسکتے، عادت نے ان کے خیالات کو راسخ اور عمر
نے قوائے ذہنی کو فرسودہ کر دیا ہے۔ یہ بے چارے کسی
طرح نئے خیالات نہیں قبول کرسکتے۔ چنانچہ تمھاری نکتہ چینی
علاوہ بیجا ہونے کے لاحاصل بھی ہے۔ تمھیں چاہیئے کہ
جو وقت مناظرے میں صرف کرتے ہو اسے اور مفید کاموں
میں صرف کرو۔ اپنے دوست محمد علی کو دیکھو۔ اگرچہ اسے
تمھاری سی ذہانت اور جودت نہیں عطا ہوئی ہے لیکن اس
کی تلافی قدرت نے قوتِ عمل سے کر دی ہے۔ بحث مباحثہ
جھگڑے بکھیڑے سے اسے کوئی مطلب نہیں، خاموشی سے
اپنا کام کئے جاتا ہے۔ گویا ایک بھاری بھرکم جہاز ہے جس پر
طوفان کا کوئی اثر نہیں ہے، جو موجوں سے لڑنے کے
لئے نہیں ٹھہرتا بلکہ انھیں چیر کر اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔

سعیدہ۔ سچ کہتے ہیں آپ شیخ جی، میں بھی بھائی جان کو بہت سمجھاتی
ہوں کہ چچی جان اور میر احمد حسین سے نہ اُلجھا کریں۔

منظور۔ خیر احمد حسین تو خود مجھ سے اِس قدر گھبراتے ہیں کہ بات نہیں کرتے، البتہ چچی جان سے نہ اُلجھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کے سامنے فرشتے تسبیح و تہلیل کر رہے ہوں تو وہ اُن سے بھی لڑائی کا کوئی بہانہ نکال لیں گی۔

شیخ جی۔ ہاں، وہ کہیں گی کہ یہ جو ہر وقت بدبدایا کرتے ہیں ضرور مجھے کوستے ہیں۔

سعیدہ۔ (ہنس کر) شیخ جی اب آپ آرام کیجیے، کہیں پھر خدا نخواستہ طبیعت نہ خراب ہو جائے۔

منظور۔ (اُٹھ کر) ہاں اب ہم لوگوں کو رخصت ہونا چاہیے۔

شیخ جی۔ ذرا ٹھہرو تو، میں تم سے یہ پُوچھنا بھول گیا کہ پرسوں تم سے اور محمد علی سے کیا طے ہوا۔

منظور۔ معاملہ قریب قریب تیار ہے۔ محمد علی کو آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ اِنشاءاللہ سب اسی طرح ہو گا جیسے آپ چاہتے ہیں۔

سعیدہ۔ شیخ جی دعا کیجیے۔

شیخ جی۔ دل و جان سے دعا کرتا ہوں۔ (پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا سین

(میر الطاف حسین اپنے مکان کے سامنے نیم
کے درختوں کے سائے میں، جہاں روز سہ پہر کو
اُن کی نشست ہوتی ہے، ایک تکیے دار مونڈھے
پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اُن کے پاس کرسی پر منظور
بیٹھا ہے۔)

میر صاحب۔ بیٹا تم جانتے ہو کہ میں گھر کی کسی بات میں دخل نہیں
دیتا، مگر تمہاری بہن کی شادی کے معاملے میں کچھ ایسی پیچیدگیاں
پڑ گئی ہیں کہ تم دونوں کی محبت مجھے خاموش نہیں رہنے
دیتی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری رائے محمد علی کے ساتھ
سعیدہ کی شادی کرنے کی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ
شجاعت مرحوم کا رجحان اسی طرف تھا۔ مگر تمہاری چچی کو
ضد ہو گئی ہے کہ محمد جواد سے شادی ہو اور اُن کی بات

نہ پوری ہوئی تو خدا جانے کیا قیامت برپا کریں گی میری
رائے میں مناسب یہ ہے کہ تم رفعِ شر کے لئے اسی پر
راضی ہو جاؤ۔

منظور۔ چچا میاں، اگر محض والد مرحوم کی خواہش اور میری رائے
کی بات ہوتی تو میں آپ کے فرمانے کے مطابق یقیناً
مخالفت سے باز آجاتا۔ مگر آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہے
کہ سعیدہ خود محمد علی سے شادی کرنا چاہتی ہے اور جوّاد
کے نام سے نفرت کرتی ہے۔

میر صاحب۔ یہ میں نے بھی سُنا ہے، مگر رسمِ زمانہ یہ ہے کہ لڑکیوں
کی رائے نہ اس معاملے میں کوئی پوچھتا ہے اور نہ اس
کی طرف التفات کرتا ہے۔ دوسرے میری سمجھ میں یہ
نہیں آتا کہ جوّاد میں کیا خرابی ہے۔ علاوہ نجیب الطرفین
ہونے کے نہایت سعادت مند اور متّقی لڑکا ہے۔

منظور۔ ہاں، یہ بالکل بجا ہے، مگر بعض وجوہ سے سعیدہ انہیں
پسند نہیں کرتی اور رسمِ دنیا کچھ بھی ہو عقل والفاظ کا
اور حکم شرع کا یہی تقاضا ہے کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر
اُس کی شادی نہ ہونا چاہیئے۔

میر صاحب۔ ہاں، یہ بھی تم ٹھیک کہتے ہو۔ (کچھ سوچ کر) مگر بھئی
محمد علی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نیچری ہو گیا ہے۔

منظور۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ محمد علی بھائی کے مذہبی عقائد
بالکل وہی ہیں جو والد مرحوم کے تھے۔ اب یہ آپ بہتر جانتے
ہیں کہ وہ نیچری تھے یا نہیں۔

میر صاحب۔ نہیں نہیں۔ شجاعت مرحوم کا سینہ نور ایمان سے معمور
تھا۔ بعض امور میں مثلاً استخارے کے یا ان اوراد و وظائف
کے معاملے میں جو کسی مراد سے پڑھے جائیں البتہ مرحوم کا
عقیدہ راسخ نہ تھا، سو کوئی نہ کوئی ضعف سوائے معصومین
کے ہر شخص کے ایمان میں ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ رحمٰن و
رحیم ہے، ان خطاؤں سے درگذر کرے گا۔

منظور۔ بس تو محمد علی بھائی کی نسبت بھی جناب کو یہی اعتقاد رکھنا
چاہیئے۔

میر صاحب۔ ایک اور پیچیدگی بھی تو ہے۔ محمد علی پردے کا مخالف
ہے اور چونکہ اس کا قول اور عمل واحد ہے وہ اپنی زوجہ
کو ضرور باہر نکالے گا۔

منظور۔ اس مسئلے پر جہاں تک مجھے یاد ہے والد مرحوم نے جناب

سے ایک بار بحث کی تھی اور ثابت کیا تھا کہ شرع میں جس
پردے کی تاکید ہے وہ آنکھ اور دل کا پردہ ہے۔ یہ
قید فرنگ نہیں۔

میر صاحب۔ مرحوم نے یہ بحث ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میرے
سامنے کی تھی اور اُن کے دلائل ضرور قوی تھے، مگر کچھ
بھی ہو مجھے یہ گوارا نہیں کہ ہمارے خاندان کی لڑکی میموں
کی طرح ماری ماری پھرے۔

منظور۔ مجھے یقین ہے کہ محمد علی بھائی سعیدہ کو اُس کی مرضی کے
خلاف ہرگز باہر نکلنے پر مجبور نہ کریں گے۔ البتہ اگر وہ خود
چاہے تو اسے روکنا بڑی جواب دہی کا کام ہے۔

میر صاحب۔ مجھے ایک اور بات بھی تم سے پوچھنا تھی۔ کیا تم اپنے
بھائی بہنوں کی جائداد الگ کرانے کے لئے مقدمہ
لڑ رہے ہو؟

منظور۔ چچا میاں، آپ نے جتنی باتیں سنی ہیں یہ ایک ہی سازش
کے سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اِن باتوں
سے گھبراتے ہیں، لیکن ذکر آگیا ہے تو مناسب سمجھتا ہوں
کہ اختصار کے ساتھ پورا معاملہ آپ کو سمجھا دوں۔

آپ کو اِس کی خبر نہیں ہے کہ خاندانی جائداد میں جتنا حصہ
آپ کا ہے وہ سر سے پیر تک قرضے سے زیر بار ہے۔
سیتا رام جس دن چاہے نالش کرکے اُس پر قبضہ کرسکتا ہے
لیکن اُسے انتظار اس کا ہے کہ آہستہ آہستہ اور قرض
دے کر بقیہ جائداد کو بھی اپنے قبضے میں کرے۔ اسی لئے
اُسے اِس امر میں خاص دلچسپی ہے کہ سعیدہ کا عقد محمد جواد
سے ہو جو اس کے مقروض ہونے کے سبب سے پہلے
ہی سے اس کے قابو میں ہیں۔ اس کی ان سازشوں کا
سدِ باب کرنے کے لئے میں نے درخواست دی ہے
کہ جائداد کا بٹوارہ کردیا جائے تاکہ میں خود گنگا سہائے کی
مدد سے اپنے حصّے کی دیکھ بھال کروں۔ بس اتنی سی بات
ہے، نہ کوئی مقدمہ ہے نہ معاملہ۔

میر صاحب۔ سنتا ہوں کہ اگر یہ امر وقوع میں آیا تو مہاجن فوراً
نالش کردیں گے۔

منظور۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو کیونکہ آپ جس ذریعے سے سب
باتیں سنا کرتے ہیں وہ سیتا رام کے مقاصد کا صحیح ترجمان
ہے۔ لیکن اگر نہ کیا جائے تو کچھ دن کے بعد وہ پراسرار

مہاجن جن کا سیتا رام ہر بات میں حوالہ دیا کرتا ہے پوری جائداد پر قبضہ کرلیں گے۔ کم سے کم ایک حصہ تو بچالینا چاہیئے

میر صاحب۔ خیر بھئی، تم اِن باتوں کو بہتر سمجھتے ہو۔ میں خود کو رائے دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔ تم احمد حسین سے مشورہ کرکے جو مناسب سمجھو کرو۔

منظور۔ (مسکراکر) بہت بہتر۔

(پردہ گرجاتا ہے)

چوتھا ایکٹ

پہلا سین

(محمد علی کا مکان، دفتر کا کمرہ۔ وسط میں ایک میز ہے جس پر رجسٹر، کاغذات وغیرہ ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ جس طرف دروازہ ہے اس دیوار پر بڑی گھڑی لگی ہے اور چند نقشے لٹکے ہوئے ہیں۔ اس کے مقابلے کی دیوار سے لگی ہوئی الماریاں رکھی ہیں جن میں کتابیں سلیقے سے چنی ہوئی ہیں۔ تیسری طرف دو کھڑکیاں ہیں جن سے خانہ باغ نظر آتا ہے۔ وسط میں میز کے تین طرف تین کرسیاں رکھی ہیں۔ چوتھی طرف جدھر رجسٹروں کے اونچے ڈھیر رکھے ہیں کوئی کرسی نہیں ہے۔ ایک کرسی پر محمد علی بیٹھا رجسٹر میں پنسل سے نشان کر رہا ہے اور بیچ بیچ میں گھڑی اور دروازے کی طرف نظر ڈالتا

جاتا ہے۔ چند منٹ میں دروازے کے باہر سے
قدموں کی آواز آتی ہے اور منظور دروازہ کھول کر
اندر آتا ہے۔ پیچھے پیچھے گنگا سہائے کاغذوں کا بستہ
دبائے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور جھک کر
آداب بجا لاتے ہیں۔)

منظور۔ (مصافحہ کرتے ہوئے) بھائی صاحب، معاف کیجیئے گا ذرا سی دیر ہو گئی۔ اسٹیشن پر اتفاقاً انجمن اتحاد المسلمین کے سکرٹری مل گئے۔ ان کی گاڑی میں دیر تھی۔ میرے پیچھے پڑ گئے کہ انجمن کا نیا دستور العمل سُن لو۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے سو ڈیڑھ سو صفحے کی کتاب سُنانا شروع کر دی اور اس تیزی سے کہ میں اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ٹوک دینے کے خوف سے وہ سانس کسی جملے کے ختم پر نہیں توڑتے تھے بلکہ درمیان میں۔ وہ تو کہیئے گاڑی وقت پر آگئی مجبور ہو کر چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے مگر میری تسکین کے لئے پکار پکار کر کہتے گئے کہ بقیہ دفعات کسی دن میرے گھر پر آکر سُنائیں گے۔

محمد علی۔ اچھا اب فوراً کام شروع کر دینا چاہئے۔ مجھے ایک

پنچایت میں سوہن پور جاتا ہے۔

(دونوں کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں)

محمد علی۔ بیٹھئے منشی گنگا سہائے صاحب۔

(گنگا سہائے کرسی ہٹا کر فرش پر بیٹھنا چاہتے ہیں)

منظور۔ ہائیں یہ کیا کرتے ہیں۔ آپ کرسی پر بیٹھئے۔

گنگا سہائے۔ حضور لوگوں کی عزبا پروری ہے ورنہ فدوی یہ صلاحیت کہاں رکھتا ہے۔ (جھک کر آداب بجا لاتے ہیں اور کرسی کے سرے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

منظور۔ آپ کی پنچائتیں خوب ترقی کر رہی ہیں۔ سنا اب کوئی مقدمہ عدالت میں نہیں جاتا۔

محمد علی۔ نہیں یہ تو مبالغہ ہے، البتہ چھوٹے چھوٹے معاملات اکثر پنچایت ہی میں طے ہو جاتے ہیں۔

منظور۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ آپ کی کوشش سے ہمارے کسانوں میں خودداری اور جمہوریت کی روح پیدا ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بیدار ہو رہی ہے کیونکہ جدید تاریخی تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ قدیم الایام سے ہندوستان کے دیہات میں حکومتِ خود اختیاری کے اصول پر

زندگی بسر کی جاتی تھی۔ یہ صرف چند دن کی بات ہے کہ غلامی کا طوق ہماری گردن میں پڑ گیا ہے۔ (گنگا سہائے سے) آپ بتا سکتے ہیں کہ اِس کا کیا سبب ہے؟

گنگا سہائے۔ چھوٹے میاں، ہم لوگ یہ امورات کیا جانیں۔ البتہ یہ جانتے ہیں کہ کلجگ کے ایام ہیں۔ لگان بڑھتا جاتا ہے اور پیداوار کم ہوتی جاتی ہے۔

محمد علی۔ اچھا اِس کی تحقیقات پھر کریں گے۔ (گنگا سہائے سے) آپ سب کاغذات ساتھ لائے ہیں؟

گنگا سہائے۔ ہاں حضور فدوی نے ہمہ جہت سے پابندی احکام کی کی ہے۔

محمد علی۔ اچھا اِنھیں یہاں چھوڑ جائیے میں اطمینان سے دیکھوں گا آپ پرسوں پھر بارہ بجے کی گاڑی سے تشریف لائیے گا اور شام تک یہیں قیام کیجیے گا۔ البتہ اس وقت مجھے بڑے میر صاحب کی جائداد کے متعلق چند سوال کرنا ہیں۔

گنگا سہائے۔ ارشاد فرمادیں۔

محمد علی۔ بڑے میر صاحب کے حصے پر مجموعی قرضہ کتنا ہے؟

گنگا سہائے۔ حضور کُلہم اُنیس دستاویزیں ہیں جن کی میزان زر اصل

کی بتّیس ہزار ہے اور سود در سود مل کر پچاگن کے ختم تک تہتّر ہزار چار سو بانوے روپے گیارہ آنے سات پائی ہوتے ہیں۔

منظور۔ آپ یہ غضب دیکھتے ہیں بتیس ہزار قرضہ اور چالیس ہزار سود۔ یہ (سود خواروں کی قوم جونک کی طرح انسان کے لپٹتی ہے اور ایک قطرہ خون کا نہیں چھوڑتی۔ ہمارے ملک میں عدالتیں بھی ہیں، جج بھی، کاؤنسل بھی قانون بھی، مگر اس وحشیانہ ظلم کے رد کرنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔) انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ سیاہ کار جیل خانوں میں جگہ پائیں اور وہ لوگ جو جان بوجھ کر خود کو ان کے حوالے کرتے ہیں پاگل خانوں کو زینت دیں۔

محمد علی۔ اِس حصے کی سالانہ آمدنی کیا ہے؟

گنگا سہائے۔ حضور آمدنی جو ہے سو اس کا یہ حساب ہے کہ کھاتہ وغیرہ احمد میاں کے پاس ہے اور فدوی کو دیکھنے کی مجال نہیں، البتہ کاغذات پٹواری کے حساب سے گذارش کر سکتا ہے۔ ساڑھے چھ ہزار آمدنی بڑے سرکار کے حصے کی ہے...... حضور کہنے کی بات نہیں...... وہ ادھر اُدھر

دیکھ کر، سارا نظم و نسخ اس قدر ابتر ہے کہ اللہ تعالیٰ تیری پناہ۔ بہت سے اسامیوں پر برسوں کی باقی ہے اور بہتوں سے دو دو بار پوتا لیا جاتا ہے، نہ پرانے چاہات کی مرمت ہوتی ہے نہ نئے بنوائے جاتے ہیں۔ منظور میاں اور صاحبزادی کا حصّہ بھی اتنا ہی بڑا ہے مگر اس کی آمدنی سال گذشتہ میں آنے پائی چھوڑ کر سات ہزار سات سو گیارہ تھی اور پھر یہ حصّہ بھی پوری طرح فدوی کی سپردگی میں نہیں ہے فدوی تحصیل وصول کر کے احمد میاں کو دے دیتا ہے اور زمین میں لگانے کے لئے مانگتا ہے تو ایک پائی بھی نہیں ملتی اگر دو تین بار کر کے ایک دس ہزار روپیہ جائداد میں لگا دیا جائے تو آمدنی ڈیوڑھی ہو جائے۔

منظور۔ منشی جی آپ اطمنان رکھئے چند دن میں ہمارا حصہ الگ ہوا جاتا ہے، پھر آپ جو مناسب سمجھئے کیجئے۔ (محمد علی سے) بھائی صاحب لالہ بالکشن کہتے تھے کہ اب کی پیشی میں ضرور بٹوارے کا حکم ہو جائے گا اس وقت ضرور آپ کو موجود ہونا چاہیئے ورنہ اکیلے میرے بنائے کچھ نہ بنے گا، جب انسان کے ایک طرف پٹواری اور دوسری طرف قانون گو

ہو تو عقل تو یوں ہی گم ہو جاتی ہے۔

محمد علی۔ تم بالکل فکر نہ کرو، سب کچھ ہو جائے گا۔ (گنگا سہائے سے) بڑے میر صاحب کے حصے کی تخمینی قیمت کیا ہوگی، اور اگر نیلام ہوا تو کہاں تک دام لگیں گے؟

گنگا سہائے۔ حضور قیمت آپ یہ دیکھیئے کہ بتانا بہت مشکل ہے، کیونکہ ساری بات بیچنے والے اور خریدنے والے کی ہی سلیقے سے معاملہ کیا جائے اور مال دوستی خریدنے والا مل جائے تو دو لاکھ سے زیادہ ہی مل رہے گا۔ رہا نیلام تو اس میں کوڑی کے مول چیز جاتی ہے۔ جتنا قرضہ ہے اتنے بھی دام لگ جائیں تو غنیمت ہے۔

منظور۔ ہاں، بھائی صاحب میں نے سنا ہے کہ سیتا رام نالش کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ سعیدہ کی شادی جو آد سے ہنیں ہو گی تو فوراً نالش کر دے گا اور جائداد نیلام کرائے گا۔ مجھے بڑا اندیشہ ہے کہ اس کے بعد کام کیسے چلے گا۔ ہم بھائی بہن اپنی آمدنی کا جتنا حصہ لیا کرتے ہیں اگر اس سے بھی کم لیں تب بھی چچا جان کے یہاں کا خرچ پورا ہنیں پڑے گا۔

گنگا سہائے۔ حکم ہو تو فدوی اپنی رائے ناچیز عرض کرے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اگر اس کا تہائی حصہ ہوشیاری سے فروخت کیا جائے تو سارا قرضہ ادا ہو سکتا ہے اور باقی جائداد بے داغ بچ جائے گی۔

منظور۔ لیکن فروخت کرے کون؟ احمد حسین سے یہ اُمید رکھنا بالکل فضول ہے کہ اُن کی سمجھ میں بات آئے گی۔ ایک تو وہ پہلے ہی سے معذور تھے دوسرے سیتا رام نے اور اُلو بنا رکھا ہے۔ رہے چچا جان، تو وہ کسی حساب ہی میں نہیں ہیں

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ سرکار گھوڑا تیار ہے۔

محمد علی۔ (اُٹھ کر) اچھا، اب مجھے کپڑے بدل کر فوراً جانا ہے (منظور سے) تم ابھی ٹھہرو، تم سے مدرسے کے متعلق باتیں کرنا ہیں۔ مشن اسکول کی نئی معلمہ مس ایلن چائے پر آئیں گی ان سے بھی مشورہ کریں گے۔

منظور۔ بہت اچھا۔

محمد علی۔ تو منشی جی، پرسوں سوا بارہ بجے۔

گنگا سہائے۔ فدوی بسر وچشماں حاضر ہو گا۔

(نوکر دوبارہ داخل ہوتا ہے)

نوکر۔ حضور، مسلمین کے سکتر صاحب آئے ہیں، منظور میاں کو پوچھ رہے ہیں۔

منظور۔ ارے یہ بزرگ یہاں کیسے پہنچے۔ میرے سامنے ریل میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے تھے۔ کیوں منشی جی تم نے بھی تو دیکھا تھا گنگا سہائے۔ ہاں، چھوٹے میاں، دیکھنے میں تو یہی معلوم ہوا تھا جیسے گاڑی میں دوڑ کر بیٹھ گئے ہوں۔

منظور۔ نہیں صاحب معلوم ہونا کیا معنی، انھوں نے گاڑی چلنے کے بعد کھڑکی میں سے سر نکال کر مجھ سے بات کی تھی۔

محمد علی۔ خیر بھئی، میں تو اب جاتا ہوں، تم جی بھر کے ان کی صحبت کا لطف اٹھاؤ۔

(چلا جاتا ہے)

منظور۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا معاملہ ہے۔ (پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے) خیر وہ خود آتے ہیں؛ ان سے معلوم ہو جائے گا۔

(سکریٹری صاحب داخل ہوتے ہیں۔)

سکریٹری صاحب۔ آداب عرض ہے میاں منظور صاحب! بھئی

عجب دل لگی ہوئی۔ میں اسٹیشن پر آپ سے باتوں میں ایسا مشغول تھا کہ بے سوچے سمجھے غلط گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مجھے جانا تھا پورب کی گاڑی سے اور وہ تھی برانچ لائن کی گاڑی۔

منظور۔ برانچ لائن کا پلیٹ فارم ہی تھا، کوئی دوسری گاڑی وہاں سے کیوں چھوٹنے لگی مجھے معلوم نہ تھا آپ کو کہاں جانا ہے ورنہ روک لیتا۔

سکریٹری صاحب۔ جب گاڑی مدرسے کے پاس پہنچ کر تحصیل کی کچہری کی طرف مڑی تب مجھے معلوم ہوا کہ غلط گاڑی میں بیٹھ گیا ہوں۔ خیر دوسرے اسٹیشن پر اتر کے یکہ کر کے فوراً واپس ہوا۔ خیال تھا کہ شاید پورب والی گاڑی گھنٹے سوا گھنٹے لیٹ ہوئی تو مل جائے گی۔ یہاں اسٹیشن پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کمبخت ٹھیک وقت پر چھوٹ گئی۔ بہر حال میں نے تار دے دیا کہ جلسہ کل پر ملتوی کر دیا جائے پھر جی میں آیا کہ آپ کو بقیہ دستور العمل سنا دوں۔ خیال تھا کہ محمد علی صاحب بھی ہوں گے، مگر معلوم ہوا کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ (ایک ضخیم مسودے کو کھول کے)

تو کہیے شروع سے سناؤں یا جہاں سے چھوڑا تھا وہاں سے؟

منظور۔ آپ اس وقت بے کار زحمت فرماتے ہیں۔ پروگرام کے خراب جانے سے آپ کی طبیعت بدحظ ہو گی، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

سکریٹری صاحب۔ نہیں صاحب، یہ اتفاقات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔ جب قومی کام کرنا ٹھہرا تو طبیعت کی بدحظی کا خیال کیا؟ اچھا تو میں جہاں تک پہنچا تھا وہاں سے شروع کرتا ہوں۔ "دفعہ ایک سو ستائیس"

منظور۔ معاف فرمائیے گا، مجھے قصبے میں ایک دوست سے ملنا ہے .... پورا دستور العمل سنوں گا تو دیر ہو جائیگی

سکریٹری صاحب۔ نہیں توبہ، دیر کیا ہو گی، سو صفحے سے بھی کم باقی ہیں اور وہ بھی دُور دُور لکھے ہوئے۔ آج آپ صرف سُن لیجئے اس پر بحث کسی فرصت کے دن ہو گی۔

(تیزی سے)، دفعہ ایک سو ستائیس " سکریٹری کے فرائض

سکریٹری انجمن پر لازم ہے کہ خدا کا خوف اور قوم کا درد دل میں رکھے۔ "نہی عن المنکر" اور "امر بالمعروف" کا عامل ہو، زندگی کو فانی جانے اور آخرت پر ایمان لائے، قوم

کی بہبودی کے لئے دل و جان سے کوشش کرے۔ اس امر میں ذرا بھی شک نہ کرے کہ افراد کی زندگی قوم کی زندگی سے وابستہ ہے، ہیئتِ قومی سے الگ ہوکر کوئی فرد کشاکشِ حیات میں سلامت نہیں رہ سکتا۔ غرض جملہ امور جو حسب دفعہ ایک سو گیارہ تا ایک سو پندرہ ممبروں پر فرض قرار دیے گئے ہیں سکریٹری پر بدرجہ اول فرض ہیں۔ اسے چاہیئے کہ اپنے عمل کو نمونہ بنائے جس کی ممبر تقلید کرسکیں اور اس طرح دونوں جہان میں سُرخ روئی حاصل کریں۔ علاوہ اس کے سکریٹری کے فرائضِ مخصوصی حسب ذیل ہیں جو گیارہ شعبوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں: شعبہ الف انجمن کے اجلاس کی اطلاع سکریٹری ممبروں کو اجلاس سے پہلے دے گا۔۔۔۔۔۔۔

(پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا سین

(میر صاحب کی نشست گاہ۔ میر صاحب اپنی معمولی جگہ پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ شیخ جی جو نہایت ضعیف نظر آرہے ہیں رضائی اوڑھے تکیے دار مونڈھے پر رونق افروز ہیں۔ محسن اور محمد جواد بھی موجود ہیں۔ احمد حسین بے چینی کے ساتھ دالان میں ٹہل رہے ہیں۔)

احمد حسین۔ (گفتگو جاری رکھتے ہوئے) میر سجاد حسین کا نام بادن گاؤں میں مشہور تھا، ہر طرف دھاک بندھی ہوئی تھی۔ اس گھر کے محرّم کی ضلع بھر میں دھوم تھی۔ آج اسی خاندان کی آبرو مٹی میں مل رہی ہے، سر بازار جائداد نیلام ہو رہی ہے اور آسمان نہیں پھٹ پڑتا۔

میر صاحب۔ لاحول ولا قوۃ۔ توبہ کرو توبہ۔ جو مرضی الٰہی ہو اس میں بندے کو دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

احمد حسین۔ توبہ، نعوذ باللہ، سب کر کے دیکھ لیا کچھ فائدہ نہیں ہوتا
یہ حرام زادہ سیتا رام آستین کا سانپ نکلا مجھے مل جائے تو
بوٹیاں چبا جاؤں۔ میرے یار غار بنے تھے، بچپن کے دوست
ہم مکتب، خاندان کے خیر خواہ، ہولی دوالی، عید بقرعید
تھالی بے کر آتے تھے ہر وقت آید میاں آید میاں کہتے منھ
سوکھتا تھا۔ اور اب کیسی طوطے کی سی آنکھیں بدل لیں۔
پرسوں میں گیا تو مجھے دیکھتے ہی گھر میں چلا گیا اور بیٹے کو
سکھا دیا کہ کہہ دو نہیں ہیں۔

محسن۔ کم بخت نے اتنی جلدی نالش نہ کی ہوتی تو میں روپے کی
فکر کرتا۔ دو شنبے کو مجھے تار پہنچا، چار دن میں کیا ہو سکتا تھا۔
اتنی جلدی زیور بھی اچھے داموں نہیں بیچا جا سکتا تھا۔ اگر تین
مہینے کی مہلت ہوتی تو روپے کا فراہم ہونا کوئی بات نہ تھی

جواد۔ جی ہاں، یہ مزید تعجب ہے کہ سیتا رام کو اتنی جلدی کیا پڑی
تھی "دیر آید درست آید"

احمد حسین۔ جی ہاں، آپ بھی کیا بھولے بنے جاتے ہیں۔ جلدی اس
کی تھی کہ جائداد نیلام پر چڑھے تو خود اونے پونے خرید
لے۔ آپ دیکھئے گا اگر بولی سیتا رام کے نام نہ ختم ہو تو میرا

نام احمد حسین نہیں - اور یہ سب کیا دھرا ہے اس منظور کا -
(شیخ جی کی طرف دیکھتے ہوئے) خدا جانے کن مفسدوں
نے کان بھر دئے تھے لڑکے کے - جائداد کا بٹوارہ ہوا
وہ گنگا سہائے کا بچّہ سفید و سیاہ کا مالک مقرر ہوا - ایک
تو اس بات سے مہاجن بھڑک گیا دوسرے شادی کے
معاملے میں بزرگ دودھ کی مکھّی کی طرح نکال کر پھینک
دئے گئے اور میری اور ہمشیرہ صاحبہ کی ضد پر ملحد نیچری
محمد علی سے نسبت قرار پائی اس نے جو کانسٹکاروں کی
انجمن کا جال پھیلا رکھا ہے اس کے سبب سے دنیا بھر کے
مہاجن اُس سے جلتے ہیں - نسبت ہونا تھی کہ سیتا رام کے
تلووں سے آگ لگ گئی ، اُس نے نالش داغ دی - اب
صاحبزادے منظور الدولہ بہادر کہتے ہیں کہ اپنی اور بہن
کی آمدنی کا نصف چچا جان کو دیا کریں گے - پوچھئے جب
دونوں حصّوں کی آمدنی میں گھر کا خرچ نہیں چلتا تھا تو
ایک حصّے کے نصف میں کیا ہوگا؟

محسن - منظور اس وقت ہیں کہاں؟ میں ابھی گھر میں گیا تھا - وہاں
امّاں جان نے قیامت برپا کر رکھی ہے - کل سے سعیدہ

کے پیچھے پڑی ہیں، سوائے اُسے کوسنے اور بُرا بھلا کہنے کے کوئی کام نہیں۔ سنا ہے کہ سر وتا پھینک کر مارا تھا۔ وہ بیچاری ایک کونے میں بیٹھی سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہی ہے۔

احمد حسین۔ جی ہاں، بس دنیا میں دو قصوروار ہیں ایک میں ایک میری بہن! اِس گھنی لڑکی کے کرتوت کسی کو نہیں معلوم، ہمدردی کرنے کو سب موجود ہیں۔ آج چوتھا دن ہے کہ محمد علی کی سگی مشن کی میم ڈراتی ہوئی گھر میں چلی آئی اور دو گھنٹے بیٹھ کے سعیدہ بیگم سے باتیں کیں۔ ہمشیرہ صاحبہ کو جواد سے نسبت ٹوٹنے کے بعد یوں ہی اس لڑکی کی صورت سے نفرت ہوگئی ہے، دوسرے میم کا اِس طرح گھر میں چلے آنا سیدانی کے دل پر تیر کی طرح لگا۔ اس وقت تو جھجک کے سبب سے کچھ نہ کہہ سکیں مگر دل میں بات لئے رہیں۔ پھر ان بھائی بہنوں کی بدولت جو بزرگوں کی ہڈیاں بک رہی ہیں اِس کا صدمہ اور بھی طرّہ ہوگیا اِن سب باتوں نے ہمشیرہ صاحبہ کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ دو دن سے ایک نوالہ نہیں کھایا ہے اور رو رو کر آنکھیں سُجا لی ہیں۔ ایسی حالت میں

اگر لڑکی کو جھڑک دیا تو کیا اندھیر ہو گیا۔

محسن۔ ہاں، یہ میں بھی جانتا ہوں کہ اماں جان کے لئے بڑا سخت موقع ہے لیکن سعیدہ بے چاری سے سب کا بدلہ کیوں نکالتی ہیں اور میم کے آنے میں کیا خرابی ہو گئی۔ سچ پوچھئے تو ہم ایسوں کی عزت افزائی ہے کہ ایک مشن کی میم صاحبہ وہ بھی امریکن نہیں انگریز قوم کی ہمارے گھر پر آئیں۔

جواد۔ کیوں ناظر جی صاحب، کیا امریکہ کی عورتیں بھی میم صاحب کہلاتی ہیں؟

میر صاحب۔ منظور آتا تو گھر میں جا کر اپنی چچی کو سمجھاتا کہ آہ و بکا سے کیا فائدہ ہے اور لڑکی پر کیوں تشدد کرتی ہیں یہ تو بڑی بات ہے۔

شیخ جی۔ بجا ہے، منظور ہی سیدانی کو سمجھائیں گے! ان کے پاس اس وقت بو علی سینا بھی جائیں تو چولھے کی جلتی ہوئی مٹی اور کھولتا ہوا پانی لے کر گل حکمت کر دیں۔

احمد حسین۔ شیخ جی، آپ کو کسی بات کا حس بھی باقی رہا ہے یا بالکل عقل نے جواب دے دیا۔ غضب خدا کا سادات کی آبرو جا رہی ہے، بزرگوں کا نام مٹ رہا ہے اور آپ اسی

بے فکری سے مذاق کر رہے ہیں۔

شیخ جی۔ سادات کی آبرو چند بگہ زمین میں نہیں ہوا کرتی۔ اس کے مخزن اُن کے سینے ہیں۔ اگر سیادت کا خیال ہے تو صبر اختیار کیجئے جو آپ کے بزرگوں کا شعار ہے۔

احمد حسین۔ بس باتیں بنانا آپ سے سیکھ لے۔ دوسرے کی مصیبت پر صبر کرنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کبھی ایک بگہ زمین بھی نصیب ہوئی ہوتی اور پھر وہ اس طرح سر بازار نیلام ہوتی تو البتہ قدر ہوتی۔ (پھر ٹہلنے لگے) بارہ بج چکے ہیں مگر ابھی تک نیلام کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ بات یہ ہے کہ نیلام کیا ملی کشتی ہے۔ معلوم ہے کہ مہاجن کے مقابلے میں کون بولے گا۔ ستر اسّی ہزار اس کے پہلے سے ہیں ضرورت پڑ گئی تو دو چار ہزار اور دے دے گا چلئے چھٹی ....

(دور سے شور وغل کی آواز آتی ہے۔ سب سے بلند صدا "سرکاری بولی پچاس ہزار") لیجئے شروع کر دیا بے ایمانوں نے۔ انھیں سوائے ہمارے پچھواڑے کے کوئی اور جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ (آواز پچپن ہزار، پچپن ہزار، پچپن ہزار ایک) کیسا بڑھ بڑھ کے بول رہے ہیں جیسے ان کے

باپ ہی کی جائداد تو ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے آدھے گاؤں، خانہائے رعایا، باغات سب پر سیتارام کا قبضہ۔ (آواز پچپن ہزار ایک۔ پچپن ہزار دو۔ پچپن ہزار ایک دو۔)...... باقی گاؤں میں گنگا سہائے کا ڈنکا بج رہا ہے۔ رہ گئے میر الطاف حسین اور کمبخت احمد حسین۔ دونوں کی گاؤں میں کوئی حیثیت نہیں۔ دونوں رعیت ہیں سیتارام کی، منظور کی اور گنگا سہائے کی۔ کل تک میرے نام سے اسامی تھراتے...... (آواز ساٹھ ہزار ساٹھ ہزار......) صورت دیکھ کر کانپتے تھے اور اب؟ اب کوئی بات بھی نہ پوچھے گا۔ بلکہ مجھ پر ہنسا کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ اور تو اور یہ بینی پرشاد جس نے میری طرف سے سیکڑوں اسامیوں کی قرقیاں کیں۔ (آواز ستر ہزار ستر ہزار۔ ستر ہزار ایک......) بڑی بڑی رقمیں لیں دعوتیں چکھیں اب آج وہ میری قرقی کرنے آیا ہے میں ہمیشہ سمجھا کرتا تھا کہ بڑا بھلا مانس ہے مگر معلوم ہو گیا دنیا غرض کی ہے کسی کا اعتبار نہیں۔

محمد جواد۔ ملازمان سرکار پر تعمیل حکم شاہنشاہی واجب ہے وہ

کیسے (آواز ستر ہزار۔ ستر ہزار........) کسی کی رو رعایت کر سکتے ہیں۔ "پردہ داری می کند بر قصر قیصر عنکبوت"

احمد حسین۔ بس چپ بیٹھئے۔ آپ سے کس نے بولنے کو کہا.....

(آواز ستر ہزار ایک دو۔ ستر ہزار........) آئے وہاں سے بڑے ملازم سرکار بن کے! اس ساری مصیبت میں آپ کو بھی بہت دخل ہے۔ اگر آپ میں ذرا بھی عقل ہوتی.....

(آواز۔ ستر ہزار۔ ایک دو۔ ایک دو۔ تین) بیٹھئے ایک دو تین (سر تھام کر) نیلام ختم ہو گیا اور صاف ظاہر ہے کہ سیتا رام کے نام پر کیوں کہ کوئی دوسرا اگر بولتا تو سیتا رام اتنی تھوڑی رقم پر کیوں خاموش رہتا۔ میری آنکھوں میں اس وقت اندھیرا چھا رہا ہے میرے سر میں چکر آ رہا ہے خدا جانے ہمشیرہ صاحبہ کا کیا حال ہو گا۔ میں جاتا ہوں ذرا ان کی خبر لوں۔ (چلے جاتے ہیں۔)

میر صاحب۔ رضا بقضاہ وتسلیما لامرہ۔ مگر بھئی احمد حسین کے حال پر مجھے بہت ترس آتا ہے۔ بے چارہ بدحواس ہو رہا ہے

جواد۔ پہلے تو میر احمد حسین بڑے مومن بالغیب تھے۔ میری بڑی خاطر کیا کرتے تھے۔ چند دن سے خدا جانے کیا ہو گیا ہے

کر بات بات پر زجر و توبیخ کرنے لگے "مردانِ خدا خدا نباشند، لیکن ز خدا جدا نباشند"

(منظور داخل ہوتا ہے)

منظور۔ (غصے کے لہجے میں) چچا جان، میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں۔ سواری تیار ہے۔ سعیدہ ڈیوڑھی میں کھڑی ہے اگر تکلیف نہ ہو تو چل کر اُسے خدا حافظ کہہ دیجئے۔

میر صاحب۔ کیوں۔ کہاں؟

شیخ جی۔ اتنی جلدی؟

منظور۔ بس انتہا ہو چکی، اب ایک منٹ اس منحوس گھر میں ٹھہرنا مجھ پر حرام ہے۔ کل سے اس غریب لڑکی پر زد و کوب سب و شتم کا کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا گیا ہے۔ اس بدبخت نے منہ سے اُف تک نہیں کی لیکن چہرے پر خون کی ایک بوند نہیں۔ مُردنی چھا رہی ہے۔ اگر وہ چند گھنٹے یہاں اور ٹھہری تو قلب پھٹ جائے گا۔ میں آج صبح سے سفر کا سامان کر رہا تھا، خالو کو تار دے دیا ہے جب تک دوسرے گھر کا انتظام نہ ہو اُن کے یہاں قیام ہوگا۔ (محسن سے) مہربانی کر کے ہم دونوں کا بقیہ سامان بھیج

دیجئے گا، اگرچہ صاحب کی مرضی ہو، ورنہ اس سے بھی
ہاتھ دھویا۔

میر صاحب۔ شیخ جی یہ کیا قیامت ہو رہی ہے؟ آپ ڈیوڑھی
میں جا کر صغریٰ کی ماں سے گفتگو کیجئے۔

شیخ جی۔ بخشئے حضرت! یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ میری ڈاڑھی
کی جڑیں بہت کمزور ہو گئی ہیں، دوسرے میں تو خود منظور
کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ الگ گھر میں رہیں مگر یہ نہیں جانتا
تھا کہ اِس طرح آناً فاناً روانگی ہو گی۔ (اُٹھنے کی کوشش
کرتے ہوئے منظور سے) ذرا مجھے سہارا دو تو چل کر اپنی
بچی کو رخصت کر دوں۔ (منظور سہارا دے کر اٹھاتا ہے)

میر صاحب۔ (آبدیدہ ہو کر) بیٹا منظور، فی امان اللہ! شیخ جی مجھ
سے سعیدہ کو رخصت نہیں کیا جائے گا۔ آپ میری طرف
سے آیۃ الکرسی پڑھ کر اس کے بازو پر دم کر دیجئے گا۔
مرضی الٰہی میں کوئی چارہ نہیں۔

(شیخ جی منظور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں اور پیچھے
پیچھے محسن۔)

(پردہ گرجاتا ہے)

تیسرا سین

ڈیوڑھی کے دروازے کے پاس ایک بے
پردے کی رتھ کھڑی ہے اور اس کے پیچھے ایک چھکڑا
خادمات اندر سے اسباب لا کر نوکروں کو دے رہی
ہیں جو چھکڑے پر بار کر رہے ہیں۔ دروازے کے
قریب شیخ جی منظور کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے
ہیں اور ان کے قریب محسن۔ ڈیوڑھی کے اندر سے
رقیہ بیگم کی رو رو کے باتیں کرنے کی آواز آ رہی ہے۔

رقیہ کی آواز۔ سعیدہ، اب بھی ہوش میں آجا اگر تجھے سادات
کی آن، کنبے کی آبرو کا خیال نہیں ہے تو اپنے چچا کی ضعیفی
پر تو رحم کر۔ ارے کیا تیرے دل میں میری محبت ذرہ
برابر بھی نہیں ہے۔ خدا گواہ ہے میں نے تجھے ہمیشہ اپنی
بیٹی سے بڑھ کر سمجھا ہے۔ تیری تربیت اور دیکھ بھال میں

اپنی جان ہلکان کر دی۔ تیری انوکھی طبیعت سے کڑھ کڑھ کر جگر کا خون کر دیا۔ کوئی لحظہ ایسا نہیں تھا جس میں مجھے تیری تندرستی کی فکر نہ ہو، تیرے سودائی پن کا دھڑکا نہ ہو پانچ برس سے تیرے بیاہ کا سپتا کر رہی ہوں اب خدا خدا کرکے ٹھکانا ہوا تھا کہ دنیا پلٹ گئی۔ سادات کا ستارہ ڈوب گیا، پشتینی ریاست اس خدائی خوار مہاجن کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس مصیبت کے وقت میں تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری زندگی کا سہارا مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے!

سعیدہ کی آواز۔ چچی جان، میں نے کبھی آپ کے سامنے زبان نہیں کھولی ہے مگر اس وقت جب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا آپ کا ساتھ چھوٹ رہا ہے مجھ سے بے چند لفظ کہے نہیں رہا جاتا۔ آپ یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ آپ مجھ سے جس قدر محبت کرتی ہیں مجھے معلوم نہیں یا مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا مگر اس بدنصیبی کا کیا علاج ہے کہ آپ کی محبت نے میری ڈھارس بندھانے کی جگہ میرا دل توڑ دیا ہے، مجھے خوش و خرم رکھنے کی جگہ زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ آپ کے گھر میں آئے ہوئے مجھے سات برس ہوئے۔ اس

سے پہلے میری زندگی کے دس سال کمال نگر میں ابا جان
کے ساتھ گزر چکے تھے۔ جب میں اس دس سال کا مقابلہ
ان سات برسوں سے کرتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے
جیسے کسی کو ہرے بھرے باغ کی ایک جھلک دکھا کے
تپتے ہوئے بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ سچ ہے کہ امّاں
جان کا سایہ بہت چھٹپن میں میرے سر سے اُٹھ گیا تھا۔ مگر
ابّا جان، بھائی جان اور شیخ جی کی پیار بھری نظروں کی چھاؤں
میں میرا بچپن قصے کہانی کی طرح گذر گیا۔ دسویں برس تقدیر
نے آنکھیں پھیر لیں۔ ابّا جان اللہ کے پیارے ہوئے،
اور بھائی جان اور شیخ جی مجھے لے کر یہاں آئے۔ یہاں
میں نے دوسری ہی دنیا دیکھی۔ بہلانے والی شفقت کی
جگہ سہمانے والی چاہ، ہنسانے والے پیار کے بجائے
رُلانے والی محبت، کمال نگر والے گھر کے خوش نما چمن
میں کھیلنے کی جگہ مجھے یہاں کالی کالی چار دیواری میں
بند ہو کر بیٹھنا پڑا، میرے پڑھنے لکھنے کی آزادی پر قیدیں
لگائی گئیں، دوسری لڑکیوں تک سے ملنے کی ممانعت
ہوئی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے اتنے دن کس طرح

کاٹے۔ اگر شیخ جی اور بھائی جان دل دہی کرنے والے نہ ہوتے تو میں ضرور گھٹ گھٹ کر مرجاتی۔ آج مجھے بھائی جان اسی مکان میں لے کر جا رہے ہیں جہاں سے سات برس پہلے لائے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ سے رخصت ہوتے وقت آپ کے سارے احسانوں کا جو آپ نے سچے دل سے احسان سمجھ کر کئے تھے۔ بہت بہت شکریہ ادا کروں۔ چچی جان، مجھ سے جو خطائیں ہوئی ہوں اُن سے در گذر کیجئے اور مجھے ہنسی خوشی جانے کی اجازت دیجئے۔ اچھا آداب عرض ہے صغرا بہن خدا حافظ۔ (پردہ اُلٹ کر نکل آتی ہے، نوکر منہ پھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

صغرا۔ (پکار کر) سعیدہ بہن، اللہ کو سونپا خط ضرور لکھنا۔ (دفعتہً پردہ پھر ہٹتا ہے اور رقیہ بیگم برآمد ہوتی ہیں۔ نوکر گھبرا کر چاہتے ہیں بھاگ جائیں مگر پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

رقیہ بیگم۔ لڑکی تو جاتی ہے تو میری ایک بات اور سنے جا۔ اس لڑائی میں تو جیتی میں ہاری مگر اس فتح پر بہت اترا مت۔ اس وقت تجھے بڑی خوشی ہے کہ چچی کے پنجے سے نکل کر راج

کروں گی، ملکۂ بلقیس کی طرح دنیا بھر میں میری حکومت ہوگی خلق خدا میرے سامنے آنکھیں بچھائے گی۔ مگر یہ دھوکا بہت دن نہیں رہے گا۔ ایک اٹھوارے کے اندر اندر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ خدا رسول کی نافرمانی، بزرگوں کی بے ادبی، کنبے قبیلے سے سرکشی کرکے آدمی کی کیا گت بنتی ہے۔ اگر تجھ پر راہ میں انگلیاں نہ اٹھیں، دنیا تیرے نام پر تھڑی تھڑی نہ کرے، شریفوں کی بہو بیٹیاں سن کر کانوں پر ہاتھ نہ رکھیں تو میرا نام رقیہ بیگم نہیں۔ اور اس بھروسے نہ رہنا کہ جب کہیں ٹھکانا نہ ہوگا تو پھر چچی کی گود میں آن بیٹھوں گی۔ آج سے میں نہ تیری چچی نہ تو میری بھتیجی۔ خدا نے چاہا تو جیتے جی تیری صورت نہ دیکھوں گی۔ جا بھگت اپنے کئے کی سزا۔

(اندر چلی جاتی ہے)

(اندر سے آواز آتی ہے) چل صغرا یہاں کیا کھڑی ہے۔

(سعیدہ شیخ جی کے پاس آتی ہے وہ کانپتے ہاتھوں اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔)

شیخ جی۔ بیٹی، تیری چچی کی باتیں سخت ہیں مگر بالکل سچ ہیں۔ جو کچھ

انھوں نے کہا اِس سے بڑھ کر مجھے برداشت کرنا ہے مگر ایک بات سیدانی بی بھول گئیں کہ تو شجاعت کی بیٹی ہے۔

سعیدہ۔ شیخ جی، آپ نے یہ ایک لفظ جو میری ہمت بڑھانے کے لئے کہہ دیا ہے وہ سو تقریروں پر بھاری ہے۔ خدا آپ کو ہم بھائی بہنوں کے سر پر سلامت......

منظور۔ شیخ جی، آپ جو وعدہ کیا کرتے تھے وہ نہ بھولئے گا۔ جب آپ کو اتنی طاقت آجائے کہ سفر کرسکیں تو چل کر ہمارے ساتھ رہیے گا اور ہمارے کام میں جو آپ کا اور والد مرحوم کا کام بھی ہے ہماری مدد کیجئے گا۔

شیخ جی۔ (ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں مجھے ضرور طاقت آئے گی۔ بیٹا، انسان کی ہوس کی کوئی انتہا نہیں مگر عقل ہوس کو مغلوب کرسکتی ہے۔ میری زندگی کا مقصد آج سے پورا ہونا شروع ہوتا ہے۔ تم بھائی بہن اپنی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہو رہے ہو اور مجھے دل سے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی نئی زندگی میں خوش و خرم رہو گے کیونکہ خوشی نام ہے عقیدے اور عمل کا اور یہ چیزیں ملتی ہیں تازی ہوا میں جہالت کی تاریکی اور حبس سے نکل کر۔

بے شک تم دونوں سے جُدائی خصوصًا سعیدہ سے چھوٹنا
مجھ پر بہت شاق ہے مگر زندگی اور دنیا دوسرے کی
ہیں میری نہیں۔ میری عمر کی چند ساعتیں باقی ہیں ان میں
مجھے شکر کرنے دو کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی اور
غور کرنے دو اس نئی زندگی پر جو میرے لئے آرہی ہے
میرے عمل کا دور ختم ہوچکا ہے اب میرے لئے صرف
عقیدہ باقی ہے۔ اسی میں تسکین ہے اور اسی میں نجات۔
(منظور سے) اچھا بیٹا اب تم سدھارو ریل کا وقت
نزدیک ہے۔
(منظور شیخ جی سے بغل گیر ہو کر سعیدہ کو رتھ میں بٹھاتا ہے
اور خود بھی محسن کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ گاڑیاں روانہ ہوتی
ہیں۔)

"بسم اللہ مجریہا ومرساہا"

(گاڑی میں سعیدہ اور منظور سر نکالے شیخ جی کو دیکھتے
جاتے ہیں جو اپنی لکڑی کے سہارے کھڑے ہیں۔ نوکر
چاکر سب گاڑیوں کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ شیخ جی اکیلے
رہ جاتے ہیں۔ پردہ آہستہ گرتا ہے۔)

مارچ ۱۹۵۶ء

(کوہ نور پریس دہلی)